جلد 5 شمارہ 2

اپریل تا جون 2012

چیلنج

ایڈیٹر: صبیحہ حسن

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو....

عوام مہنگائی، بے روزگاری اور بھوک تلے دب کر غربت کی ذلتوں سے بلبلا رہی ہے اور سرمایہ داری سے پیدا ہونے والی سنگین آلودگی نے قدرت کے توازن کو درہم برہم کرتے ہوئے ماحولیاتی تباہی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ سماجی انصاف کے تقاضوں کے ساتھ مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے لیے جس شعور و آگہی کی آج ضرورت ہے شاید پہلے کبھی بھی نہ تھی۔

جون 2012 میں ریو ارتھ سمٹ 1992 کی یاد میں 20 سال بعد ریو پلس 20 برازیل کے شہر ریو ڈی جنیرو میں منعقد ہوئی۔ زمین کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے لیے ریو 1992 کا سربراہی اجلاس ایک بہتر کوشش تھی جس میں پوری دنیا کے ممالک اپنے تحفظات کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ماحول اور ترقی کے درمیان تعلق کے اصول، پائیدار ترقی کے لیے عملی پروگرام، موسمی تبدیلی کے عمل کو بڑھنے سے روکنے، صحرائی علاقوں کے پھیلاؤ کو تھامنے اور حیاتیاتی تنوع کے بچاؤ جیسے اہم مسائل اس کانفرنس کے مقاصد میں شامل تھے۔ اگر ریو 1992 میں کیے گئے فیصلوں پر صحیح معنوں میں عمل درآمد کیا جاتا تو شاید آج جو مسائل ہمارے سامنے ہیں وہ اس شدت سے نہ ہوتے، لیکن 1995 میں ڈبلیو ٹی او کے قیام کے بعد نیو لبرلزم کے سائے تلے عالمگیریت کی تیز رفتاری نے ریو 1992 کی پیش رفت کو بری طرح روند ڈالا۔ ریو پلس 20 سے پہلے ترقی یافتہ دنیا کی یہ کوشش تھی کہ پائیدار ترقی کے مقصد کو سبز معیشت کے ذریعے حاصل کروایا جائے یعنی یہ نظام جو ہر چیز کو بکنے والی شے (commodity) بنا چکا ہے، اب قدرت اور اس سے حاصل کردہ انمول خدمات کی قیمت لگا کر اسے بھی منافع خوری کی ہوس کے تحت ہتھیانا چاہتا ہے۔ ریو پلس 20 عوامی نقطہ نظر سے ایک حد تک کامیاب ہوئی ہے کہ وہاں سرمایہ داری اپنی ''گرین اکانومی'' کی چالوں کو زیادہ آگے نہیں بڑھا سکی۔

اس شمارے میں ریو پلس 20 کے حوالے سے تین مضامین شامل ہیں جو اس کانفرنس میں اُٹھائے جانے والے مسائل کا مختلف پہلوؤں سے تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ریو پلس 20 سے نکلنے والی تدبیروں میں 2015 کے بعد کے لیے لائحہ عمل طے کرنا، قومی و عالمی پالیسی سازی کا اہم مرحلہ ہے۔ 2015 میں ملینیم ڈیولپمنٹ گولز (ایم ڈی جیز/MDGs) کی معیاد ختم ہو رہی ہے۔ ایم ڈی جیز نہایت کمزور اور لبرل ازم کے احاطہ کے اندر بنائے ہوئے ترقیاتی اہداف ہیں۔ ریو پلس 20 کانفرنس میں طے پایا کہ 2015 میں ختم ہونے والے ایم ڈی جیز کے بعد نئے اہداف جن کو پائیدار ترقی کے اہداف (ایس ڈی جیز/SDGs) کہا جا رہا ہے بنائے جائیں۔ اس عمل میں عوامی گروہوں کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اب وقت ہے کہ پسے ہوئے طبقے چاہے وہ صنعتی مزدور ہوں یا چھوٹے بے زمین کسان، عورتیں، ماہی گیر، چرواہے ہوں یا نوجوان، سب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سرمایہ داری نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انسانیت اور کرہ ارض دونوں کی بقاء کے لیے نئے سرے سے منظم ہو کر ایسی پائیدار ترقی کا منصوبہ وضع کریں جو استحصال اور ظلم کو للکارتے ہوئے ایک باوقار، پائیدار امن پر مبنی معاشرے کی تشکیل کو یقینی بنائے۔

اس شمارے میں ''بات تو سچ ہے مگر...'' میں تفصیل سے پاکستان میں زراعت اور ماحولیات کے حوالے سے کئی غیر پائیدار حکومتی تدبیروں اور پالیسیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ بیرونی ممالک کے امدادی ادارے خاص طور پر امریکی ادارے کس حد تک آزاد معیشت کو پاکستان پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کو واضح کیا گیا ہے۔ غیر ملکی زرعی بین الاقوامی کمپنیاں ہماری دیہی آبادیوں سے ان کی زرعی اور غذائی پیداوار کو منافع کے لیے جمع کر کے عوام کو بھوک اور کم غذا کا شکار کرنے میں تیزی سے کام کرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ یہ استحصالی طریقہ کار یقیناً پائیدار ترقی کے خیال سے بہت دور ہے۔

گزشتہ اپریل اور مئی کے مہینوں میں پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی نے زمینی اصلاحات پر صوبائی اور قومی مشاورت کا انعقاد کیا۔ اس مشاورت میں جاگیرداری کے خلاف یہ موقف سامنے آیا کہ زمین کی کسانوں میں، جس میں عورتیں بھی شامل ہوں، منصفانہ اور مساویانہ تقسیم ہونی چاہیے اس کے علاوہ کارپوریٹ فارمنگ اور زرعی آزاد تجارت کے خلاف اور خوراک کی خودمختاری کی حمایت میں بھی کسانوں اور سول سوسائٹی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ہماری کوشش ہے کہ مشاورت کی سفارشات کو آنے والے الیکشن میں حصہ لینے والی پارٹیوں کے سامنے رکھیں تاکہ وہ اسے اپنے منشور میں شامل کر کے نئی آنے والی حکومت کی پالیسی سازی میں شامل کریں۔ خود اسٹیٹ بینک نے 16 اپریل کی اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ ملک میں غذائی تحفظ کے لیے زرعی زمین کی منصفانہ تقسیم اور کسانوں کو پاکستان کے دستور کے مطابق حقوق فراہم کرنا بہت ضروری ہے۔

کسانوں کے لیے پائیدار ترقی زمین پر اختیار اور فیصلہ سازی کے بغیر ممکن نہیں۔

فہرست مضامین

ریو پلس 20 تاریخی پس منظر..... 2

پائیدار ترقی: جدوجہد کی منزلیں..... 6

سبز معیشت اور توانائی کے متبادل ذرائع..... 11

سندھ میں غریب کسان کے استحصال..... 14

میڈیا ریلیز: بی ٹی کپاس پر..... 16

زمینی اصلاحات پر قومی اور صوبائی..... 17

بات تو سچ ہے مگر..... 20

تبصرہ..... 32

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے

میزیریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی

فون، فیکس 3320 3481 21 0092 فیکس 3321 3481 21 0092

ای میل: roots@super.net.pk

ریوپلس 20 تاریخی پس منظر

تحریر: صبیحہ حسن

یہ مضمون اقوام متحدہ کے زیر انتظام پہلی ارتھ سمٹ کا سیاسی اور تاریخی پس منظر پیش کرتے ہوئے، ریو 1992 کے بعد کے حالات کے تجزیے کے ساتھ ریو 2012 کا احاطہ کرتا ہے۔

ریو 1992 کا سیاسی پس منظر

مغربی ملکوں کے خلاف 1970 کی دہائی کے آغاز میں عرب ممالک نے پہلی بار تیل کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ عربوں کے اس فیصلے نے ترقی پذیر ممالک، جو دیگر بنیادی قدرتی اشیاء برآمد کرتے تھے، کا حوصلہ اتنا بڑھایا کہ انہوں نے جلد نئے عالمی معاشی نظام کا مطالبہ کر دیا۔ اس کے بعد پہلی دفعہ شمال اور جنوب کے درمیان بات چیت کی فضا قائم ہوئی۔ جنوبی ممالک جو نوآبادیاتی دور سے تجارت میں ناانصافی برداشت کر رہے تھے نے یہ نعرہ لگایا کہ ہمیں امداد نہیں عالمی تجارت میں انصاف چاہیے۔ دوسری طرف ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک نے جلد ہی مہنگے تیل کا بہانہ بنا کر اپنی صنعتی اشیا کی برآمدات کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ کر کے امداد میں دیے جانے والے قرضوں کی شرح سود میں بھی اضافہ کر دیا۔ تیسری دنیا میں تجارت کا عدم توازن جلد قرض کے بحران کی صورت اختیار کر گیا۔ قرض کی واپسی کے لیے عالمی امدادی ادارے (آئی ایم ایف) اور عالمی بینک کے مشورے اسٹرکچرل ایڈجسمنٹ پروگرام (SAP) کی شکل میں سامنے آئے۔ سیپ (SAP) کی پالیسی نے "ایک قسم کے معاشی قتل عام"[1] کو جنم دیا۔ نجکاری، ڈی ریگولیشن اور آزاد تجارت کے لیے دوطرفہ معاہدوں کے ذریعے راستے بنائے گئے۔ سیپ کی پالیسی نے تیسری دنیا کی حکومتوں کی سرپرستی ان کے عوام پر سے اٹھانے کا ایسا انتظام کیا کہ بے روزگاری، مہنگائی، غربت، بھوک اور اس کے ساتھ نہ ختم ہونے والے مسائل سنگین تر ہو گئے۔

70 کی دہائی میں ہی چین میں ماؤ اور جواہر لائی کے انتقال کے بعد وہاں کا معاشی نظام سرمایہ داری کی طرف موڑ دیا گیا۔ 1980 کے آخر میں افغان جنگ کے بعد امریکہ واحد سوپر پاور بن کر سامنے آیا تو گلوبلائزیشن کے نعرے کے ساتھ امریکی نیولبرل پالیسی (جسے پہلے ہی سیپ کے دوطرفہ معاہدوں نے فروغ دینا شروع کر دیا تھا) کو کسی رکاوٹ کا سامنا نہ تھا۔ لہٰذا کارپوریٹ راج کی تیاریاں شروع ہونے لگیں لیکن نئے عالمی معاشی نظام نے جو خواب دیکھے تھے اس میں قدرت نے خود اپنا رنگ شامل کرنا شروع کر دیا۔ ماحولیاتی بحران کی ابتر صورت حال کے پیش نظر پہلی ریو سربراہی کانفرنس یا ارتھ سمٹ کی تیاری شروع ہوئی۔

سنگِ میل (1972 تا 1992)

یوں تو ماحول کے حوالے سے عالمی کنونشنز کی ابتدا 1946 سے ہی شروع ہو گئی تھی 2 لیکن ماحولیاتی بحث میں شمال اور جنوب کے ممالک کے تنازعات 1972 کے بعد شروع ہوئے۔ 1972 میں سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں پہلی مرتبہ عالمی سطح پر ماحول اور ترقی کے باہمی تعلق کو قائم کیا گیا اور جنوبی ممالک میں مقامی سطح پر ماحولیاتی قوانین کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کا ایک نتیجہ اقوام متحدہ کے انوائرمنٹ پروگرام (UNEP) کا آغاز تھا۔ اسٹاک ہوم اعلامیے میں ممالک کا اپنے قدرتی وسائل پر اختیار کا حق، ماحولیاتی تباہی سے متاثرہ افراد کو ہرجانے کا حق اور ماحولیاتی طور سے نقصاندہ مواد کو اپنے ملک کے اندر ہی رکھنے کی ذمہ داری کی ضرورت پر زور دیا گیا[3]۔

ترقی اور ماحول کے درمیان تعلق کو یو این کانفرنس آن ٹریڈ اینڈ ڈیولپمنٹ (UNCTAD) اور یو این انوائرمنٹ پروگرام (UNEP) کی 1974 میں میکسیکو میٹنگ نے وضع کیا۔ میکسیکو اعلامیے پر امریکہ اور ترقی یافتہ ممالک نے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے یو این انوائرمنٹ پروگرام پر دباؤ ڈالا کہ "ترقی پر نرم رویہ رکھے"[4]۔ 1975 میں غیر سرکاری ڈیگ ہمیر شولٹ (Dag Hammarskjold) منصوبے کے گرد ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے ماہر معاشیات اکٹھا ہوئے۔ اس منصوبے کو کچھ ترقی یافتہ ممالک کی مدد بھی شامل تھی۔ پروجیکٹ رپورٹ میں کہا گیا کہ شمال کی بے تحاشہ ترقی اور جنوب کی کم ترقی دونوں مسائل لیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک متبادل ماحول سے مطابقت رکھنے والے ماڈل کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ اس وقت جنوبی ممالک نئے عالمی معاشی نظام کا نعرہ لے کر چل رہے تھے جبکہ شمالی ممالک نے اپنے آپ کو ماحول کے حوالے سے "کوآپریشن کلین آپ (Cleanup)" تک محدود رکھا تھا[5]۔

1980 کی دہائی میں شمال کے ممالک اور ان کے عوام جنگلوں کے خاتمے، خاص کر ٹروپیکل رین فارسٹ کے تیزی سے خاتمے، اوزون کی تہہ میں کمی اور گلوبل وارمنگ جیسے مسائل کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اس خطرات کے پیش نظر اقوام متحدہ کی کوششوں سے نورے کے وزیر اعظم جی ایچ برانڈ لینڈ (G.H. Brundtland) کی سربراہی میں ایک آزاد ادارہ عالمی کمیشن برائے ماحول و ترقی وجود میں آیا۔ اس ادارے کے قیام کے بعد شمال اور جنوب میں ترقی کے حوالے سے بحث و تکرار شروع ہوئی۔ برانڈ لینڈ رپورٹ "ہمارا مشترکہ مستقبل" (Our Common Future) 1987 میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں شمال اور جنوب کے درمیان بحث کی خلیج کو "پائیدار ترقی" کی اصطلاح سے دور کیا گیا۔ پائیدار ترقی کی تشریح یوں کی گئی:

> Development that meets the needs of the present without compromising the ability of future generations to meet their own needs .[6]
>
> (ایسی ترقی جو موجودہ ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے مستقبل کی نسلوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت کو پس پشت نہ ڈالے)

اس رپورٹ میں دنیا کو درپیش مشترکہ مسائل کے مختلف پہلوؤں پر غیر جانب دارانہ طریقے سے غور کیا جس نے سوچنے اور سمجھنے کے بہت سے دریچے کھولے لیکن اس رپورٹ میں انصاف پر مبنی نئے عالمی معاشی نظام کا ذکر نہیں اور نہ ہی ٹیکنالوجی کی حدود کو کسی تنقید کا نشانہ بنایا ہے بلکہ ٹیکنالوجی کو بہت سے انسانی مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا ہے۔

اقوام متحدہ کی ماحول اور ترقی پر کانفرنس (UNCED) کے لیے 22 دسمبر، 1989 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر 44/228 منظور کی جس کے تحت عالمی سربراہوں کو برازیل کے دارالحکومت ریوڈی جینیرو مدعو کیا گیا۔ اس وقت شمال کے ممالک کی خواہش یہ تھی کہ ایک ارتھ چارٹر ہو جس میں کچھ ماحولیاتی اصول طے پا جائیں۔ یہ چارٹر اتنا جامع اور مختصر ہو کہ ہر بچہ اسے اپنے پلنگ کے اوپر لٹکا سکے۔ ترقی پذیر دنیا اس بات کے حق میں تھی کہ اعلانیہ ایسا ہو جو ترقی کے حق کو ماحول سے جوڑتے ہوئے شمال اور جنوب کے درمیان انصاف پر مبنی حل پیش کرے۔ گروپ آف 77 کا کہنا تھا کہ ہمارے لاکھوں بچوں کے پاس سونے کے لیے پلنگ نہیں جس کے اوپر کوئی "شاعرانہ چارٹر لٹکایا جا سکے"[7]۔ ان کے نزدیک غربت کے مسئلے کو حل کیے بغیر پائیدار ترقی ممکن نہیں۔

جون 1992 ریوڈی جینیرو میں پہلی سربراہی کانفرنس برائے ماحول اور ترقی منعقد ہوئی جسے ارتھ سمٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں پانچ دستاویز پر دستخط ہوئے: (1) ریو اعلانیہ برائے ماحول اور ترقی جس کے 27 اصول ملکوں کے مابین حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔ (2) ایجنڈا 21 جو پائیدار ترقی کے لیے عملی پروگرام دیتا ہے۔ (3) کنونشن برائے کلائمٹ چینج (موسمی تبدیلی)۔ (4) کنونشن برائے حیاتیاتی تنوع (Convention on Biodiversity)۔ (5) عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے صحرائی پھیلاؤ کو روکنے کا کنونشن۔ اس کانفرنس کی تیاری کے لیے چار کمیٹیاں جو کہ عام طور پر پریپ کومز (PrepComs) کہلاتی ہیں ترتیب دی گئی تھیں جن میں ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک کے درمیان کئی ہفتوں بحث و مباحثہ جاری رہا۔ مثال کے طور پر PrepCom4' جسے ریو اعلانیہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، میں پیش رفت تیسرے ہفتے ممکن ہوئی جب گروپ آف 77 اور چین نے ایک متفقہ مسودہ بنایا اور پھر اس مسودے کے گرد کانٹیکٹ (Contact) گروپ کے ذریعے شمالی ممالک سے بات چیت آگے بڑھی۔ سب سے پہلے 7 بنیادی اصول طے ہوئے جس میں (i) ترقی کا حق جس میں شمال اور جنوب کے درمیان انصاف پر زور دیا گیا، (ii) ماحول کو تباہ کرنے پر قیمت ادا کرنے کا اصول، (iii) ماحولیاتی تباہی کے اخراجات کا تخمینہ، (iv) مقامی لوگوں کے حقوق، (v) ماحولیاتی نقصان کی ذمہ داری اور اس کا ازالہ، (vi) ماحولیاتی تحفظ کے احتیاطی اصول اور (vii) ماحولیاتی معاملات میں عوامی شراکت شامل ہیں۔ ان میں سے بعض معاملات پر شدید اختلاف سامنے آئے اور ایسی صورت حال میں پہلی اپریل کو کانٹیکٹ گروپ کو ختم کر کے پریپ کوم چار کے شمال اور جنوب کے سربراہوں کو کہا گیا کہ وہ مسودے مکمل کریں۔ گروپ آف 77 اور چین نے اپنے گروپ کو متحد رکھا۔ پاکستان جو جنوبی ممالک کی طرف سے اس کمیٹی کو چیئر کر رہا تھا کہ نمائندے طارق حیدر نے 1970 اور 1980 کے شروع کی ان باتوں کو ابھارنے کا موقع دیا جو نئے عالمی معاشی نظام کے ولولے کے پیچھے کار فرما تھیں۔ 1992 کا زمانہ وہ تھا جب عالم گیریت کے دھوکے میں جنوبی ممالک نئے معاشی عالمی نظام کی بات کرتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔ پریپ کوم 4 کے شمالی اور جنوبی ممالک کے چیئر نے یہ واضح کر دیا تھا کہ "ریو اعلانیہ کے 27 اصول بحیثیت پیکیج ڈیل کے بہت ہی نازک توازن قائم کرتے ہیں لہذا کوئی غیر مربوط قدم پورے پیکیج کو کھول کر رکھ دے گا"[8]۔ امریکہ نے آخری وقت "ترقی کے حق" اور "مشترکہ مگر مختلف ذمہ داریوں" کے اصول پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا مگر کسی نے مسودے کو بلاک یا روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مسودے کی کئی خامیوں کے باوجود اعلانیہ اور دیگر دستاویز پر اتفاق نے پائیدار ترقی کی بحث میں ارتھ سمٹ کو کلیدی حیثیت عطا کر دی۔ ایجنڈا 21 (جس کا مسودہ ایک مختلف کمیٹی میں تیار ہوا) میں اگرچہ "پائیدار ترقی" کا لفظ آزادانہ استعمال ہوا لیکن اس کا مطلب شمال کے ممالک کے نزدیک یہ تھا کہ ان کی ترقی اسی طرح چلتی رہے جبکہ جنوب میں ترقی کو پائیدار بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس نظریہ کے لیے کچھ ممالک امداد دینے کو بھی تیار تھے۔ اس کے علاوہ شمالی ممالک کے ساتھ جنوب کے ممالک بھی ٹیکنالوجی کے فروغ کے حق میں تھے۔ جنوبی ممالک اپنے لیے ایسی تیز ترقی چاہتے تھے جو ماحول پر توجہ کو اپنے اندر سموتے ہوئے آئندہ بھی چلتی رہے۔ یہ ممالک مغربی امداد، سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی ٹرانسفر بھی چاہتے تھے۔ غریب ترین ممالک تو اس معاملے میں اور آگے تھے[9]۔ زیادہ تر غیر سرکاری تنظیمیں، خاص کر جو جنوبی ممالک سے تھیں ان کا نقطہ نظر کچھ اور تھا۔ ان کے نزدیک:

- ترقی کے لیے ایک جامع طریقہ کار کی ضرورت ہے جو تمام چیزوں کا پوری طرح (holistically) احاطہ کرے۔
- غریبوں اور پسے ہوئے طبقوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ملکوں کے اندر، ان کے مابین اور عالمی سطح پر معاشی انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل کی ضرورت ہے۔
- عالمی سطح پر بہتر معاشی نظام اور بین الاقوامی اداروں میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔
- وہ انداز زندگی جو وسائل کو ضائع کرتے ہوئے غیر ضروری خرچوں کو فروغ دیتا ہے اس کی مذمت کی جائے۔
- مناسب ٹیکنالوجی کو فروغ دیتے ہوئے کہا گیا کہ اس میں جنوب کے تاریخی ورثے کو بھی شامل کیا جائے۔
- بین الاقوامی کمپنیوں کی آزادی اور منڈی میں ان کی مونا پولی (monoply) پر بھی ضرب لگانے کی ضرورت ہے[10]۔

کہا جاتا ہے کہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ماحول و پائیدار ترقی کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی کہ اس نے ٹرانس نیشنل کمپنیوں (TNCs) کی طاقت اور کارگزاریوں کو محدود کرنے کے لیے کوئی عالمی معیار تیار نہیں کیا[11]۔ 1991 کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی 500 بڑی کمپنیاں 70 فیصد تجارت، 80 فیصد بیرونی سرمایہ کاری اور 30 فیصد GDP (جو سالانہ 300 بلین ڈالر بنتا تھا) کو کنٹرول کرتی ہیں۔ یہی 500 کمپنیاں دنیا میں آدھے سے زیادہ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کی ذمہ دار ہیں[12]۔ یہی قدرتی وسائل کو بے دریغ استعمال کر کے تباہ کر رہی ہیں۔ سیپ کی پالیسیوں نے کئی ممالک کے قوانین کمزور کر کے انہیں کمپنیوں کے لیے 1980 کی دہائی میں راستے بنائے اور 1992 کی ارتھ سمٹ کے فوراً بعد

1995 میں آزاد تجارت کے نام پر ''کارپوریٹ بل آف رائیٹس'' کارپوریشنوں کے حقوق کا بل یعنی ڈبلیو ٹی او (WTO) اپنے دیگر معاہدوں کے ساتھ قائم کیا گیا۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ اقوام متحدہ کے واحد ادارے کمیشن آن ٹرانس نیشنل کارپوریشنز (UNCTC) جس نے اپنی 15 سالہ زندگی میں پائیدار ترقی کے لیے ٹی این سیز کی نگرانی کے کچھ طریقہ کار واضع کیے تھے اسے امریکہ، جاپان اور دیگر شمالی ممالک کے دباؤ پر عین اس وقت جب GATT کے یورا گائے (Uruguay) راؤنڈ میں ٹی این سیز اپنے لیے ریاستوں جیسے حقوق مانگ رہی تھیں (جس میں آئی پی آر کے حقوق کے ساتھ وہ ہر ملک کے ہر گوشے میں اپنے پھیلاؤ کے امکانات دیکھ رہی تھیں) بند کر دیا گیا۔ UNCTC نے باقاعدہ ریو اعلانیے میں ایجنڈا 21 کے لیے بھی الگ تجاویز دی تھیں۔ ایجنڈا 21 میں انہیں اس جگہ رکھا گیا جہاں پائیدار ترقی کو مضبوط کیے جانے والی باتوں کا ذکر تھا۔ ٹی این سیز پر نگرانی ختم کر کے انہیں self regulatory یعنی ان کی اپنی صوابدید کے حوالے کر دیا گیا۔ UNCED کے سیکٹریٹ نے بزنس کونسل کے قیام کی بھی بات کی جس میں پائیدار ترقی کے لیے بڑی کمپنیوں کو خود اپنے لیے چارٹر مرتب کرنا تھا۔ ایسی کونسل ہر ملک میں قائم کرنے کو کہا گیا۔ اسی طرح ٹی این سیز کو پائیدار ترقی میں پارٹنر یعنی ایک اہم جز کے طور پر پیش کیا گیا[13]۔

ریو 1992 سے ریو 2012 تک

1992 سے 2012 تک ایک صدی ہی نہیں ایک دنیا بدل گئی۔ ان بیس سالوں میں نیولبرل عالم گیریت نے وہ گل کھلائے جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ نیولبرلازم کی اصطلاح تو پہلی دفعہ جنگ عظیم دوئم سے پہلے کے معاشی بحران میں سامنے آئی لیکن 1980 کی دہائی میں امریکی صدر ریگن اور برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے اسے پالیسی کی طور پر اپنایا اور 1989 میں اس کے لیے واشنگٹن کنسینسس (Washington Consensus) کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ یہ اس پالیسی کا تسلسل ہے جسے آئی ایم ایف اور عالمی بینک سیپ کے دوطرفہ معاہدوں کے ذریعے دنیا میں رائج کرتے چلے آرہے تھے اور جسے 1995 میں عالمی تجارتی ادارے نے عالمی سطح پر قانونی شکل دی۔ اس کے بعد سے آزاد تجارت کی دیوی کو زمانہ پوجے چلا جا رہا ہے۔ پروفیسر جوز ماریہ سیسن (Jose Maria Sison) کے الفاظ میں:

> یہ سامراجی عالم گیریت ہے جو سامراجی طاقتوں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی مناپولی کمپنیوں اور بینکوں کو اپنی ہی محنت کشوں اور دنیا کے تمام محنت کش عوام، خاص کر ترقی پزیر ممالک کی عوام کے پیچھے لگا دیں۔ ملکی معاشی اقدار اعلیٰ اور قدرتی وسائل کے حوالے سے کٹھ پتلی حکومتوں نے غداروں کی طرح گلوبلائیزیشن کے سائن بورڈ تلے سامراجی طاقتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں[14]۔

یہ سب سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ہوا جب جمہوریت، امن اور گلوبلائزیشن کو ایک ہی کڑی کا حصہ سمجھا جانے لگا تھا۔ کیا خود سرمایہ داری نظام اس دور میں فعال ہو پایا ہے؟ ایسا بھی بالکل نہیں ہوا۔ نیولبرل دور کے پچھلے 30 سالوں میں سو سے زیادہ چھوٹے بڑے بحران خود سرمایہ داریت کے حصے میں آئے۔ اس میں 08-2007 کا غذائی بحران 1930 کے گریٹ ڈپریشن (Great Depression) سے زیادہ خطرناک اثرات چھوڑ گیا جس میں قابو سے باہر بڑھتی ہوئی غربت اور مہنگائی سرفہرست ہے۔ موجودہ دور میں سرمایہ داریت یورپ سے اٹھنے والے طوفان سے بدحال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرت کے صبر کا پیمانہ بھی اب لبریز ہو چکا ہے۔ دنیا میں حالیہ ماحولیاتی تباہیاں اس کا ثبوت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ

> * سائنسی معلومات کے مطابق یہ واضح ہے کہ ماحولیاتی خطرات بہت تیزی بڑھ رہے ہیں۔ حالیہ حالات کے مطابق یوں لگتا ہے کہ دنیا میں گرمی 3 ڈگری تک بڑھ جائے گی اور ہم اس حد سے آگے بڑھ جائیں گے جو ماحولیاتی توازن کو ہلا دے گی۔ جس کے نتائج ماحولیاتی تباہ کاروں کی صورت میں آسکتے ہیں۔ کرہ ارض اس وقت ہولوسین (Holocene) جو کہ ایک موسمی، ماحولیاتی توازن ہے خیال کیا جاتا ہے کہ انسانی کاروائیاں کرہ ارض کو ہولوسین سے باہر دھکیل دیں گی جس نے انسانی ترقی کو پچھلے 10 ہزار سال سے سنبھالا ہوا تھا۔ سائنس کا خیال ہے کہ اب دنیا ایک نئے دورانیہ میں جارہی ہے جس کو اینتھر وپوسین (Anthropocene) کام لیا جارہا ہے۔ اس دورانیہ میں انسان سب سے زیادہ قوی طاقت ہے[15]۔

یعنی قدرت نے ہمیں پچھلے 10,000 سال تک جس پیار سے سنبھالے رکھا تھا وہ دور اب ختم ہو رہا ہے اور انسانی مداخلت کے نتیجے میں نتائج بھگتنے کا دور اب شروع ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے بہت سے بنیادی کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ انسانی معاشرہ دوبارہ سے قدرت کی گود میں پناہ لے سکے۔ اس پس منظر میں ہم ریو 1992 کے بعد 2012 تک کیے گئے کچھ اقدامات کا جائزہ لیتے ہیں:

1۔ کیوٹو پروٹوکول:

موسم کے حوالے سے یہ نقطہ بنیادی ہے کہ غریب ممالک اور ان کے غریب ترین عوام سب سے زیادہ موسمی تبدیلی کے اثرات سے دوچار رہے ہیں حالانکہ وہی اس تبدیلی کے سب سے کم ذمہ دار ہیں۔ صنعتی ترقی یافتہ ممالک جہاں زمین کی کل آبادی کا 20 فیصد حصہ ہے وہ 60 فیصد کاربن کے اخراج کے ذمہ دار ہیں[16]۔ تاریخی اعتبار سے بھی تیسری دنیا کے ممالک کا ترقی یافتہ ممالک پر کاربن کے زیادہ اخراج کی وجہ سے ایک طرح کا قرض ہے جسے انہیں ادا کرنا ہے۔ یہاں یہ بھی ماننا ہوگا کہ چین جیسا ملک جو ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہوتے ہوئے سب سے آگے بڑھ رہا ہے اس وقت سب سے زیادہ اخراج کا ذمہ دار ہے لیکن تاریخی اعتبار سے یا فی کس آبادی کے حساب سے چین جیسا ملک بھی بہت پیچھے ہے۔

موسمی تبدیلی پر اقوام متحدہ کا فریم ورک کنوینشن (UNFCCC)، جو 1992 میں ہی

قائم ہوگیا تھا، نے 1997 میں جاپان کے شہر کیوٹو میں موسمی تبدیلی کے حوالے سے پہلا اہم قدم اٹھاتے ہوئے ایک دستاویز یا پروٹوکول مکمل کیا۔ اس نے 37 ترقی یافتہ صنعتی ممالک کو پابند کیا کہ وہ لازمی طور پر 1990 کے اخراج کو بنیاد بناتے ہوئے 2012 تک 5.2 فیصد کاربن اخراج میں کمی لائیں کیونکہ وہ اس اخراج کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ ترقی پزیر ممالک پر ایسی کوئی پابندی نہیں رکھی گئی تھی۔ یہ پروٹوکول کا پہلا مرحلہ تھا۔ 2012 کے بعد کے دوسرے دور کے لیے فیصلے بعد میں ہونے تھے۔ امریکہ نے اس پروٹوکول کو قبول نہیں کیا اس جواز پر کہ ترقی پزیر ممالک بھی کاربن کے اخراج میں لازمی کمی لائیں۔ یہ پروٹوکول 2005 میں نافذ ہوا۔ اس دوران اس کے اندر ترقی یافتہ ممالک کی کمپنیوں کے کہنے پر ''لچکدار'' طریقہ کار (flexible mechanisms) کو شامل کروایا گیا[17]۔

لچکدار طریقہ کار کے تحت اندرون ملک اخراج میں کمی کے ساتھ ساتھ مارکیٹ کو جوڑتے ہوئے کاربن اخراج کی تجارت (Carbon Emission Trading) کی بھی اجازت تھی ان ممالک کے ساتھ جو کم کاربن اخراج کرتے ہیں۔ اسی طرح صاف ترقی کے طریقہ کار (Clean Development Mechanism) یا CDM (سی ڈی ایم) میں کاربن کریڈٹ ترقی پذیر ممالک میں ماحولیاتی منصوبوں کے لیے استعمال ہوسکتے تھے مثلاً متبادل انرجی کے منصوبے وغیرہ۔ تیسرا طریقہ کار (Joint Implementation) سرمایہ کاری سے متعلق تھا یعنی کم اخراج والے ممالک میں کاربن اخراج کم کرنے کے لیے بیرونی سرمایہ کاری۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے موسمی تبدیلی کے اثرات سے نمٹنے کے لیے پروٹوکول میں مناسب امداد کی سفارش بھی تھی۔ اس کے لیے اقوام متحدہ نے عالمی مالیاتی سہولت (Global Environment Facility) رکھی تھی لیکن کاربن ٹریڈنگ کے لیے سی ڈی ایم اور سرمایہ کاری کے لیے عالمی بینک نے کلائمٹ انویسٹمنٹ فنڈ قائم کیا تھا[18]۔ 1990-2006 کے درمیان ترقی یافتہ ممالک نے اپنے کاربن اخراج میں کمی کے بجائے اس میں 10 فیصد اضافہ کیا[19] سوائے چند یورپین ممالک جنہوں نے اخراج میں کمی کی۔ جہاں تک مالیاتی اقدام یا سہولت کا تعلق ہے تو 2007 کے ایک تخمینے کے مطابق ترقی پزیر ممالک اس سال کی کل رقم کا صرف 2.5 فیصد[20] اس مد میں دے پائے۔

دراصل موسمی تبدیلی کی آڑ میں سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک آزمائے ہوئے پرانے حربے یعنی امداد، تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری کے ذریعے ایسی نئی محتاجی پیدا کرنے کا ارادہ کرچکے تھے جس کی مثال پہلے کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ وہ ترقی پذیر دنیا کے قدرتی وسائل پر قبضے کے مواقع اپنے منافع اور ترقی کے لیے ڈھونڈ رہے تھے اس میں کاربن اخراج میں کمی کا تعلق صرف بہانہ تھا۔ اس حوالے سے عالمی ایگروکیمیکل کمپنیوں کی طرف سے جینیاتی بیج کا بے تحاشہ فروغ اور ایگروفیول کی فصلوں کی ترغیب ایسی مثالیں ہیں جس نے قدرتی نظام کے لیے سنگین خطرات اور غذائی بحران کا سامان پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم صرف 2007 سے 2008 تک کے ایک سال میں بین الاقوامی کاربن مارکیٹ کو دیکھیں تو اس میں 64 بلین ڈالر سے 126 بلین ڈالر کا اضافہ ہوا[21]۔ امریکی Commodities Future Trading Commision کے مطابق کاربن مارکیٹ مستقبل میں سب سے بڑی تجارتی مارکیٹ ہوگی۔ اس کے لیے عالمی بینک (جو مارکیٹ پر مبنی پالیسی کے ذریعے غریب ممالک کا اپنے وسائل پر اختیار کو ہمیشہ سے کم کرتا آیا ہے) کو ان معاملات میں شامل کر کے اقوام متحدہ کے UNFCCC کے تحت اپنے انتظام کو غیر فعال کردیا گیا۔

(اس مضمون کا بقیہ حصہ چیلنج کے اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔ ایڈیٹر)

حوالہ جات

1- See Michel Choussudovsky, The Globalization of Poverty: Impacts of IMF and World Bank Reforms, Penang, Third World Network, 1997.

2- For a brief Chronology see Gareth Porter and Janet Welsh Brown, Global Environmental Politics, Dilemmas in World Politics Series, Boulder, San Francisco, Oxford, Westview Press, 1991, pp. 193 - 195.

3- Chee Yoke Ling, The Rio Declaration on Environment and Development; An Assessment, Penang, Third World Network, p. 14.

4- Ibid.

5- Chakravarthi Raghavan, "Earth Summit; Right to development vs right to waste", in Earth Summit Briefings, Penang, Third World Network, 1992, quoted in Chee Yoke Ling, ibid., p. 15.

6- Our Common Future, a report of the World Commission on Environmentz & Development, Oxford, Oxford University Press, 1987, p.43.

7- Chee Yoke Ling, op, cit., pp. 3 - 4.

8- Ibid., p. 12.

9- Ibid., p.17.

10- Ibid., pp 21 - 22.

11- Ibid., p.17.

12- Ibid.

13- Ibid., p. 23.

14- Jose Maria Sison, "Neo Liberalism: A Scourge to Humankind", International League of Peoples, Struggle, 20th August 2012.

15- Gro Harlem Brundtland, "Earth agonistes," The Express Tribune, p.8 (global edition).

16- See Weathering The Climate Crisis: The Way of Ecological Agriculture, Pesticide Action Network Asia and the Pacific (PAN AP), 2012, p. 34.

17- Ibid., p. 42.

18- Ibid.

19- Ibid., p. 43.

20- Ibid.

21- Ibid.

* The scientific evidence is clear that the environmental dangers are rising quickly. Based on current trends, we are likely to move toward a world warmer by 3 degrees, and we may well cross tipping points with potentially catastrophic consequences. Human activities are likely propelling the planet out of the climatically and ecologically stable state, the Holocene, which has sustained human development over the past 10,000 years. Science reports that we are now instead entering a new geological epoch, the Anthropocene, where humans have become the most potent force.

پائیدار ترقی: جدوجہد کی منزلیں اور....

تحریر: عذرا طلعت سعید

22-20 جون، 2012 برازیل کے شہر ریو میں اقوام متحدہ کانفرنس برائے پائیدار ترقی (یونائیٹڈ نیشنز کانفرنس آن سسٹینیبل ڈیولپمنٹ) منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کو ریوپلس 20 بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے اقوام متحدہ کانفرنس برائے ماحول اور ترقی 1992 میں اسی شہر ریو میں ہی منعقد کی گئی تھی۔ جنوبی امریکہ کے براعظم میں ایک ملک برازیل میں ہونے والی یہ کانفرنس پاکستانیوں اور خاص کر کے کسانوں کے لیے کیوں اہم ہے؟ اس لیے کہ اس کانفرنس میں تیسری دنیا کی عوام جس میں ہم بھی شامل ہیں کے حوالے سے اہم فیصلے ہوئے ہیں اور آنے والے سالوں کے لیے مزید مسائل پر فیصلہ سازی کا ایک عمل شروع کیا گیا ہے جس میں کئی عوامی گروہوں کے شامل ہونے کا طریقہ کار وضع کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ پسے ہوئے طبقے سے چاہے وہ مزدور ہوں یا کسان یا نوجوان وخواتین اس عمل میں حصہ لے کر اپنے لیے اس زمین پر منصفانہ طرز زندگی کا دائرہ کار تشکیل کرنے کے علاوہ اس کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کا انتخاب کریں۔

اقوام متحدہ کانفرنس برائے پائیدار ترقی کے تحت سرکاری گفت وشنید دو موضوعوں پر کی گئی:

1- سبز معیشت کو کس طرح پروان چڑھایا جائے کہ پائیدار ترقی حاصل کی جائے اور عوام کو غربت سے کیسے نکالا جائے؟

2- پائیدار ترقی کے لیے بین لاقوامی سطح پر کیسا ادارہ قائم کیا جائے جو پائیدار ترقی کے لائحہ عمل کو نافذ کرے۔

ریوپلس 20 ایک عالمی کانفرنس تھی جس میں امیر اور غریب دونوں ممالک نے شرکت کی تھی۔ امیر ممالک جو کہ کہا جاسکتا ہے کہ سرمایہ داری نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔ ریوپلس 20 میں ہونے والی پائیدار ترقی کے نام پر ہونے والی پالیسی سازی کا سرمایہ داری کے تحت فروغ دینے کی کوشش میں تھے گو کہ تیسری دنیا کے ممالک آنے والی پالیسی سازی کے فریم ورک میں سرمایہ داری کی نفی نہیں کر رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ غربت کے خاتمے پر بھی زور دے رہے تھے۔

اس سے پہلے کے پائیدار ترقی پر مزید تفصیل سے بات کی جائے ضروری ہے کہ ریوپلس 20 میں ریاستوں کے طرز بحث ومباحثہ کو سمجھا جائے۔ کانفرنس منعقد ہونے کا اعلان اقوام متحدہ کے 2010 کے اجلاس میں کر دیا گیا تھا۔ دسمبر 2011 میں ایک بنیادی مسودے جسے زیرو ڈرافٹ (zero draft) کہا گیا پیش کیا گیا۔ جس پر عوامی گروہ رائے اور تنقید کر سکتے تھے۔ جنوری، 2012 سے لے کر جون، 2012 تک اقوام متحدہ نے چار الگ الگ دفعہ زیرو ڈرافٹ پر بحث کرنے کے لیے پری پیٹری کمیٹیوں (preparatory committees) کے اجلاس بلائے۔ ان اجلاسوں میں ساری دنیا کی ریاستوں نے حصہ لیا۔ زیرو ڈرافٹ پر بحث ومباحثہ ہمیشہ ریاستی نمائندوں کے درمیان ہوتا رہا۔ عوامی نمائندوں کو 1992 کے لیے کانفرنس میں 9 گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان کو اکثر میجر گروپس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان میں شامل ہیں: ۱۔ عورتیں، ۲۔ بچے اور نوجوان، ۳۔ مقامی لوگ (indigeneous people)، ۴۔ غیر سرکاری تنظیمیں، ۵۔ مقامی حکومتیں، ۶۔ مزدور اور ٹریڈ یونین، ۷۔ بزنس اور انڈسٹری، ۸۔ سائنسی اور ٹیکنالوجیکل کمیونٹی اور ۹۔ کسان۔ ان گروہوں کو حکومتی نمائندوں کے درمیان ہونے والی بحث مباحثے کے کمروں میں بیٹھنے کی اجازت تھی لیکن بیچ میں بولنا سختی سے منع تھا۔ اگر میٹنگ میں بیٹھنے کے بتائے طریقہ کار سے ہٹ کر کوئی بھی میجر گروپ کا کارکن حکومتی کاروائی میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کرتا تو اس کو وہاں سے ہٹانے کا مکمل اختیار تھا۔ ریوپلس 20 کانفرنس کے دوران اور اس سے پہلے ہونے والی تیاری کی دیگر میٹنگ میں کبھی بھی کسی میجر گروپ کے کارکن نے اصولوں سے ہٹ کر کوئی طریقہ کار استعمال نہیں کیا اور بتائے ہوئے طریقہ کار اور اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔

پائیدار ترقی کی وضاحت کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

انسان میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ترقی کو پائیدار بنا سکے۔ یعنی ''ایسی ترقی جو کہ آج کی نسل کی ضروریات کو پوری کرتے ہوئے مستقبل میں آنے والی نسلوں کی ضروریات کو زد میں نہ لائے''۔ اقوام متحدہ کی 2005 ورلڈ سمٹ کا مسودہ پائیدار ترقی کے 3، ستونوں کی نشاندہی کرتا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے محتاج اور ایک دوسرے کو سہارے دینے والے ہیں۔ اس کے مطابق یہ 3 ستون معاشی ترقی، سماجی ترقی اور ماحولیاتی حفاظت ہیں۔

آج سے بیس سال پہلے ریو کانفرنس کا انعقاد اس خیال کی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ کرہ ارض ماحولیاتی آلودگی کے زد میں آچکا ہے۔ کئی طرح کے موسمی تغیرات کے سامنے آرہے تھے لیکن جس شدت سے موسمی بحران کا سامنا پچھلے 5 سے 6 سال سے ہو رہا ہے آج سے 20 سال پہلے نہیں تھا۔ اب یہ ایک عام بات ہے کہ کرہ ارض شدید موسمی بحران کا سامنا کر رہا ہے۔ دنیا کا درجہ حرارت بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا کے عمومی موسمی دائرے میں مستقل تغیر پایا جا رہا ہے۔ چیلنج کے پچھلے شماروں میں کلائمیٹ چینج یا موسمی تبدیلی پر مضمون چھپ چکے ہیں۔ اس لیے یہاں پر صرف یہ دوہرایا جا رہا ہے کہ زمینی درجہ حرارت کے بڑھنے کی وجہ سرمایہ دار ممالک کی صنعتی پیداوار ہے۔ صنعتی پیداوار صرف فوسل فیول (یعنی کوئلے، قدرتی گیس اور ایندھن) کے استعمال پر مبنی ہے۔ یہ فوسل فیولز جب جلائے جاتے ہیں تو کئی طرح کی شدید نقصاندہ گیسیز خارج کرتے ہیں جن کو کاربن گیسیز کہا جاتا ہے۔ کاربن گیسیز دنیا کے اردگرد ایک ہالہ سا بناتی جا رہی ہیں جو کہ زمین سے آسمان کی طرف جانے والی گرمی کو واپس دنیا کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ زمینی درجہ حرارت بڑھنے کی بنیادی وجہ صنعتی پیداوار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کاربن گیسیز ہیں جو نہ صرف سورج کی حرارت کو اپنے اور جذب کرتی ہیں بلکہ ان

گیسیز سے بننے والے ہالے کی وجہ سے سورج کی اضافی حرارت کو بھی زمین کے اندر ہی رکھتی ہیں۔ جس کی موسمی تغیر عروج پر آتا جارہا ہے۔ اب دنیا کے کئی طرف سے آواز آرہی ہے جس میں پہلی اور تیسری دنیا کے باشندے اور ریاستیں شامل ہیں۔ فوسل فیول کی پابند صنعتی پیداوار اب کرہ ارض اور انسانی زندگی کی بقا کے لیے ممکن نہیں ہے۔ سائنسی تحقیق کا کہنا ہے کہ موسمی بحران پر قابو پانے کے لیے عالمی کمیونٹی کو کاربن گیسیز کی اخراج میں کئی فیصد کمی کرنی ہوگی۔ سرمایہ داری اس حقیقت کو سمجھ چکی ہے اور اس کے لیے ماحولیاتی بحران ایک بڑا چیلنج ہے لیکن اس نظام نے اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے نئے راستے وضع کر لیے ہیں۔ سرمایہ داری صنعت نے توانائی حاصل کرنے کے لیے نئے طریقوں کے لیے ٹیکنالوجی کی نشاندہی کر لی ہے۔ اس ٹیکنالوجی کو گرین ایکانومی کے نام سے پیش کیا جارہا ہے۔ سبز معیشت کو منوانے اور خاص کر تیسری دنیا کے ممالک کے پالیسی سازی ڈھانچے میں ڈھالنے کے لیے ریوپلس 20 کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔

ریوپلس 20 کے اختتام پر زیرو ڈرافٹ پر شدید بحث مباحثے کے بعد برازیل کی حکومت نے بطور میزبان یہ فیصلہ سنایا کہ اب اس کی آخری شکل وہ خود ترتیب دے گی۔ جس کے نتیجے میں 19 جون کو برازیل کی حکومت نے اب تک زیرو ڈرافٹ پر ہونے والی بحث و مباحثے کو بنیاد بناتے ہوئے ''دی فیوچر وی وانٹ'' (The future we want) کے نام سے آخری مسودہ پیش کیا۔ اس مسودے کو اقوام متحدہ سے جڑے ہوئے تمام ممالک نے تسلیم کیا۔ یہ مسودہ ''دی فیوچر وی وانٹ'' یعنی ''وہ مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگر اس مسودہ کو پڑھا جائے تو سمجھ میں آتی ہے کہ سرمایہ دار ممالک کے ارادے اپنے طریقہ پیداوار یعنی سرمایہ داری سے مکمل طور پر بندھے ہوئے ہیں۔ اس مسودے پر عوامی اداروں کی کئی بنیادوں پر شدید تنقید آرہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک کی حکومتی نمائندوں نے بھی پوری کوشش کی کہ صنعتی ممالک کی منافع خوری کی تدبیروں کو مسودہ میں کم سے کم جگہ دی جائے لیکن اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آخر کار دی فیوچر وی وانٹ یقیناً سرمایہ داری نظام کو زیادہ تحفظ دیتا ہے لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اس مسودہ میں کئی ایسے پہلو بھی شامل کیے گئے ہیں جو کہ عوام اور پسے ہوئے طبقوں کے لیے بہت حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ دی فیوچر وی وانٹ میں کئی طرح کی سیاسی سوچ کو جگہ دی گئی ہے گو کہ سرمایہ دار سوچ زیادہ غالب ہے لیکن ماحولیاتی بچاؤ پر یقین رکھنے والے گروہوں کا بھی مسودے پر اثر موجود ہے۔ ان حقیقتوں کی کچھ وضاحتیں مندرجہ ذیل دی گئی ہیں۔

مسودہ کا پہلا باب ''آور کومن ویژن'' یعنی ''ہماری مشترکہ تصور'' میں پائیدار ترقی کے تین بنیادیں یعنی معاشرتی معاشی اور ماحولیاتی پائیداری کو پھر سے شامل کیا گیا ہے۔

یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اس وقت عالمی چیلنج میں سب سے بڑا غربت کا مٹاؤ ہے اور اس کے بغیر پائیدار ترقی ممکن نہیں ہے۔ مزید یہ کہ غربت کا مٹاؤ غیر پائیدار طریقہ پیداوار اور کنزمشن (صرف/خرچ) کو پائیدار طریقہ پیداوار اور کنزمشن میں بدلنا اور معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے قدرتی وسائل کی بنیاد اور اس کا استعمال اور حفاظت دراصل ہمہ گیر (overarching) مقاصد بھی ہیں اور پائیدار ترقی کی ضرورت بھی۔

آور کومن ویژن میں یہ کہا گیا ہے کہ ''ہم پھر یقین سے یہ کہتے ہیں کہ پائیدار ترقی حاصل کرنے کے لیے:

- سب فریقین کو اکھٹے لے کر چلتے ہوئے مستقل، منصفانہ معاشی بڑھوتری کو فروغ دینا ہوگا۔
- (معاشرے میں پائے جانے والے) فرق کو کم کرنا ہوگا۔
- سب کے لیے بہتر مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔
- بنیادی معیار زندگی کو بڑھانا ہوگا۔
- سب کو ملاتے ہوئے منصفانہ سماجی ترقی کو فروغ دینا ہوگا۔
- قدرتی وسائل اور ماحولیاتی نظام کے مربوط (انٹگریٹیڈ) اور پائیدار استعمال کو فروغ دینا ہوگا جو کہ معاشی، سماجی اور انسانی ترقی کو سہارا دے سکیں۔ لیکن ساتھ ساتھ نئے اور ابھرتے ہوئے مسائل کے حوالے سے ماحولیاتی تحفظ (کنزرویشن)، دوبارہ پیداوار (ریجنریشن) اور بحالی (ریسٹوریشن) اور جلد سمبھلنے کی صلاحیت (ریزیلینس) بھی بڑھا سکے۔ آخر میں آور کومن ویژن یہ عہد کرتا ہے کہ ''پائیدار ترقی کچھ مربوط اور ہنگامی سطح کی عمل کاری مانگتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک بڑے پیمانے پر اتحاد ہو جس میں عوام، سرکار، سول سوسائٹی اور نجی شعبہ سب کا ساتھ کام کرنا ضروری ہے تاکہ ہم ابھی اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کا تحفظ کر سکیں''۔

یہ مسودہ inclusion یعنی سارے فریقین کو ملاتے ہوئے مسائل کا حل ڈھونڈتا ہے۔ یہ سوچ عوام اور منظم تحریکوں کے لیے سوالیہ نشان ہے۔ لفظ انکلوژن کا استعمال پسے ہوئے طبقوں کو سب سے ملانے کی اصطلاح کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ کن فریقین کو ملانا ہے؟ غریب پسے ہوئے مزدور طبقوں کو دنیا کی معاشی و سماجی و ماحولیاتی تباہی کے ذمہ دار سرمایہ دار نجی طبقے سے یا پھر چھوٹے بے زمین کسانوں کو جاگیردار طبقے سے پسے ہوئے طبقوں اور اشرافیہ کی ''ترقی'' کی ضروریات مکمل طور پر دو الگ راستوں کے چناؤ پر مبنی ہیں۔

کسان آبادیوں کی پائیدار ترقی یا پائیدار زراعت کی کیا ضرورت ہے؟ سب سے پہلے کسان آبادیوں کو زرعی زمین پر اجتماعی حقوق کی ضرورت ہے یعنی ان آبادیوں کو مستقبل کے لیے یہ یقین چاہیے کہ زمین پر انہی کا حق ہے۔ یقیناً چھوٹے بے زمین کسانوں کو اگر اپنی پائیدار ترقی حاصل کرنی ہے تو جاگیرداروں سے زمین حاصل کرنی پڑے گی۔ یقیناً یہ ضرورت باہمی اتفاق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

مزید یہ کہ کسانوں کو اپنی پیداوار اور فصلوں کے لیے منصفانہ قیمتیں اور منڈی، پانی، اپنا بیج اور گوبر کھاد چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ زرعی کارپوریٹ شعبے کو اپنی ''ترقی'' کے لیے کیا چاہیے؟ یقیناً مارکیٹ پر کنٹرول تاکہ وہ اپنی مرضی سے زرعی اشیاء کی خرید و فرخت کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں۔ مثلاً منڈی میں مہنگی سے مہنگی بیج فروخت کر سکیں۔ اس کے علاوہ کبھی سبز انقلاب کے نام پر زہریلی مواد اسپرے، یوریا اور کبھی دیگر کھادیں کسان کی ضرورت بنانا زرعی کمپنیوں کے لیے لازم ہے ان اشیاء کا استعمال نہ غریب کسان کی غربت مٹا سکتا ہے اور نہ ہی ماحول کو تحفظ دے سکتا ہے۔ زرعی شعبوں میں سرمایہ دار مہنگی سے مہنگی قدرتی -آرگینک کھاد کو فروغ دیتے ہوئے منڈی میں بیچ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ دار چاہے وہ زرعی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، صحت سے، توانائی کے شعبے سے یا پھر کسی بھی شعبے سے

کیوں نہ ہو اس کا پہلا ''ترقیاتی'' مقصد منافع کمانا ہے۔ اس زمرے میں ایک طرف وہ مزدور کو کم سے کم اجرت دینے دوسری طرف اپنے اعلیٰ افسران کو لاکھوں روپے تنخواہ، گھر، گاڑی اور دیگر مہنگی ترین سہولتیں دینے پر مجبور ہیں کیونکہ یہی طبقہ ایک پرتعیش زندگی کے حصول کے لیے اس طبقاتی نظام کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر کیسے سارے فریقین آپس میں مل بیٹھ کر پائیدار ترقی کو وضع کر سکتے ہیں؟

اس حوالے سے ایک مثال ہے کہ پائیدار ترقی کے مد میں سورج سے توانائی (سولار انرجی) یا پھر ہوا سے توانائی (ونڈ ملز) حاصل کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ پاکستان کا سرمایہ دار طبقہ اس طریقہ توانائی کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے اس ٹیکنالوجی کو حاصل کر کے لاگو کرنے میں سرگرم ہے۔ ان کے نزدیک اس پائیدار ٹیکنالوجی سے زرعی آب پاشی کے لیے ٹیوب ویل سستی قیمتوں پر چلایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ڈیزل جو کہ گلوبل وارمنگ کا ذمہ دار ہے سے نجات پائی جا سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ زمینی پانی جس کو بہت بڑے پیمانے پر ٹیوب ویل کے ذریعے بے دریغ استعمال کیا جائے گا۔ پائیدار زراعت کا عکاس نہیں۔ ٹیوب ویل یقیناً پائیدار ترقی اور ماحولیاتی تباہی کا ضامن ہے۔ اگر سرمایہ دار واقعی پائیدار ترقی کو سمجھتے اور اس کو حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے تو ایسی ٹیکنالوجی کو فروغ نہیں دیتے۔ یہی کچھ مثالیں ہم جینیاتی بیج کے حوالے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس بیج کو بھی پائیدار ترقی کی زمرے میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس بیج سے بہت بڑے پیمانے پر ماحولیاتی آلودگی پھیل رہی ہے کیونکہ یہ قدرت میں پائی جانے والی بیج کو آلودہ کر رہی ہے۔ بی ٹی کپاس جیسی جینیاتی بیج کے ذریعے نا صرف کپاس کی روایتی بیجوں میں آلودگی پھیل رہی ہے بلکہ زمین میں زہر منتقل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے کیڑے مکوڑوں مثلاً منارک تتلی کو بھی شدید نقصان ہوا ہے۔ کسانوں کے مطابق بی ٹی کپاس کا بنولہ کھانے سے جانوروں میں دودھ کی مقدار میں کمی آئی ہے۔ کیونکہ غیر جانبدارانہ تحقیق بہت کم ہے اس لیے نقصان کا احاطہ مشکل ہے۔ یقیناً جس تیزی سے انسانوں اور جانوروں میں بیماریاں بڑھ رہی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ ماحولیاتی بحران میں بہت اضافہ ہوا ہے لیکن زرعی کمپنیوں کے لیے یہ بیج منافع کمانے کا آلہ ہے۔ دی فیوچر وی وانٹ کے مسودے پر نظر دوڑائیں تو حقیقتاً وہ جینیاتی آلودگی کی نفی کرتا ہے۔ اس کے دوسرے باب ''رینیوینگ پولیٹیکل کمیٹمنٹ'' (Renewing Political Committment) یعنی ''سیاسی ذمہ داریوں پر قائم رہنے کا عہد'' میں نا صرف پرانے معاہدوں کی پھر سے نشاندہی کی گئی ہے (مثلاً کنونشن آن بائیوڈائی ورسٹی اور یونائیٹڈ نیشنز فریم ورک کنونشن آن کلائمٹ چینج) بلکہ یہ بھی مانا گیا ہے کہ ''کچھ ممالک پائیدار ترقی کو فروغ دینے کے حوالے سے فطرت کے حقوق مانتے ہیں ہمارا یقین ہے کہ ابھی اور آنے والی نسلوں کے درمیان معاشی، سماجی اور ماحولیاتی ضروریات میں منصفانہ توازن رکھنے کے لیے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ضروری ہے''۔

اوپر دیے گئے اقتباس کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ پائیدار ترقی دراصل اشرافیہ کے لیے صرف پیسہ کمانے کا ہتھیار ہے۔ انہیں نہ غربت مٹانے اور نہ ہی ماحولیاتی آلودگی یا بحران کو کم کرنے سے کوئی غرض ہے۔ سرمایہ دار کمپنیوں کے لیے فطرت سے ہم آہنگی اور نہ ہی فطرت کی عزت کے کوئی معنی ہیں۔ اس حوالے سے دی فیوچر وی وانٹ کا مسودہ اپنے ہی تحریر میں کئی جگہ متضاد نقطہ نظر رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اس مسودے کے چھٹے باب ''لاگو کرنے کے طریقے کار'' (میز آف امپلیمنٹیشن) کے چار سیکشنز (a) فائیننس یا مالی امور (b) ٹیکنالوجی (c) صلاحیت میں ترقی (کیپیسٹی ڈیولپمنٹ) اور (d) تجارت میں نجی شعبہ یعنی سرمایہ دار طبقے اور اس سے جڑے ہوئے ادارے مثلاً ڈبلیو ٹی او کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ ''ہم دوہراتے ہیں کہ تجارت ترقی اور مستقل معاشی بڑھوتری کا انجن ہے... اور بامعنی آزاد تجارت معاشی بڑھوتری اور عالمی ترقی میں متحرک کردار ادا کر سکتی ہے''۔ لیکن تجارت جو کہ بین الاقوامی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے ماحولیاتی آلودگی اور ایندھن کے استعمال کو بے تحاشہ فروغ دیتی ہے۔ ان حالات میں تجارت کو فروغ دینا اور پائیدار ترقی کا خواہش مند ہونا دونوں متضاد خواہشات ہیں۔ مسودہ کھل کر بین الاقوامی کمپنیوں کا ٹیکنالوجی ٹرانسفر میں ایک کلیدی کردار بیان کرتا ہے۔ تجارت کے سیکشن میں ڈبلیو ٹی او کا خاص ذکر کیا گیا ہے تو پھر کوئی ابہام نہیں رہ جاتا کہ ٹیکنالوجی منتقل کرنے میں ڈبلیو ٹی او کا ذہنی ملکیت کے معاہدہ (Trade-related aspects of Intellectual Property Rights) کا بہت اہم کردار ہوگا۔ عوامی گروہوں میں ڈبلیو ٹی او کو شدید عوام دشمن تنظیم مانا جاتا ہے اور اس پوزیشن لینے میں ذہنی ملکیت معاہدہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس طرح سے واضح ہے کہ ریو پلس 20 کانفرنس میں سرمایہ داری نظام کو پائیدار ترقی میں ایک اہم کردار دیا ہے۔ اس کے علاوہ مسودہ پبلک پرائیوٹ پارٹنرشپ کو کئی جگہ پر فروغ دیتا ہے۔

دی فیوچر وی وانٹ مسودہ پر مندرجہ بالا مختصر تبصرہ واضح کرتا ہے کہ ریو پلس 20 پر زیادہ اثر سرمایہ دار سوچ کا ہے۔ یہ وہ لابی ہے جو پائیدار ترقی ''معاشی ستون'' پر انحصار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہے کہ پائیدار ترقی کے دوسرے ستون ''ماحولیاتی پائیداری اور بقاء'' کے لیے لڑنے والے فریقین بھی اس مسودے پر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آخری لابی تیسرے ستون ''سماجی ترقی'' جو کہ ''غربت مٹاؤ'' سے جڑی ہوئی ہے۔ ان تینوں ستونوں پر 3 طرح کی سیاسی سوچ کے گروہوں کا آپس میں تناؤ رہا ہے۔ سرمایہ دار لابی معاشی ترقی کے حوالے سے آزاد تجارت / نیولبرل فریم ورک کی بنیاد پر پالیسی سازی کا رخ موڑنا چاہتی ہے اور کافی حد تک کامیاب بھی ہے۔ دوسری لابی اصلاح پسندی / ریفارمسٹ سوچ پر مبنی ہے یعنی سرمایہ داری نظام میں رہنے کے لیے راضی ہے لیکن ساتھ ساتھ ایسے حل ڈھونڈھتی ہے جس کے ذریعے ''ذمہ دار سرمایہ داری نظام'' کو فروغ دیا جائے۔ آخری لابی انقلابی گروہوں کی ہے جو کہ سرمایہ داری نظام کو رد کرتے ہوئے خود انحصاری کی سیاست کو فروغ دیتے ہیں۔ ریو پلس 20 میں پائے جانے والی سیاست کو سمجھنے کے لیے پائیدار ترقی کی کانفرنسوں سے جڑنے والی گروہوں کی تقسیم کو سمجھنا ضروری ہے۔ ریو (RIO) پروسیس میں تشکیل کردہ میجر گروپس میں آزاد تجارت، اصلاح پسندی اور خود انحصاری تینوں زاویہ سوچ کے گروپس متحرک نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ میجر گروپس میں عوامی سوچ زیادہ واضح ہے جبکہ کچھ میجر گروپس میں سرمایہ دارانہ سوچ حاوی ہے۔ پائیدار ترقی کے لیے 1992 اور اب 2012 میں ہونے والی ریو اور ریو پلس 20 کانفرنسوں کے لیے عوام کی آواز میں میجر گروپس کی تشکیل کی گئی ہے۔

ماحولیاتی پائیداری میں دو گروہ زیادہ مضبوط نظر آ رہے ہیں۔ ایک وہ گروہ ہیں جو

کہ زیادہ تر سرمایہ دار ممالک سے ہے۔ یہ لابی اصلاح پسندی پر زیادہ یقین رکھتی ہے۔ ان میں ریاست اور عوامی سول سوسائٹی کارکن دونوں شامل ہیں۔ اس لابی کا زور ہے کہ فوسل فیول یعنی تیل، گیس، کوئلے کے استعمال کو ختم کرتے ہوئے متبادل توانائی کے ذرائع استعمال کیے جائیں۔ پہلی دنیا، خاص کر کے یورپ کی عوام گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی بحران کو خطرہ سمجھتے ہوئے کاربن گیسیز کے اخراج کو کم کرنا چاہتی ہے۔ پہلی دنیا کے اس گروہ کا سہارا لیتے ہوئے یہاں کی سرمایہ کار اور سرمایہ دار کمپنیوں نے متبادل توانائی پہنچانے کے لیے کئی طرح کی ٹیکنالوجیاں دریافت کرلیں ہیں۔ اس منافع پسند آزاد تجارت کی حامی لابی کا اصل مقصد منڈی پر قابو رکھتے ہوئے اپنے منافع کو برقرار رکھنا اور بڑھانا مقصود ہے۔ ریو پلس 20 کانفرنس کے پیچھے خاص کر کے گرین ایکانومی۔ سبز معیشت کا نعرہ سول سوسائٹی کے ان گروہوں نے اپنایا ہے جو کہ اصلاح پسندی پر یقین رکھتے ہیں۔ اس گروہ کا مقصد ترقی یافتہ ممالک کی آرام دہ زندگی کو قائم رکھتے ہوئے ماحولیاتی بحران سے لڑنے کے طریقہ کار وضع کرنا ہے۔ گرین ایکانومی کے ساتھ یورپ یا تیسری دنیا کی سول سوسائٹی اگر اصلاح پسندی کا رخ اختیار کررہی ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یہی وہ لابی ہے جو کہ ''پائیدار زراعت'' کو بھی ایک مخصوص زاویہ کے ساتھ پروان چڑھا رہی ہے۔ پانی اور ہوا میں اگنے والی فصلوں (ہائیڈرو پونکس اور ایرو پونکس) دونوں طرح سے غذا کی پیداوار اور مائیکرو نیوٹرینٹس، آرگینک کھاد، کارپوریٹ زراعت کی وہ شکلیں ہیں جن کو اب پائیدار زراعت سے جوڑا جارہا ہے۔

ماحولیات کی بقا سے جڑی ہوئی کئی سول سوسائٹی راین جی اوز اس طرز کی روشن خیالی سے ابھرتی ہوئی (پائیدار زراعت) کی دلدادا ہیں۔

ماحولیات سے جڑی ہوئی دوسری گروہ وہ ہیں جو کہ تیسری دنیا کہ پسے ہوئے طبقے سے اپنے آپ کو جوڑتی ہے اور پائیدار ترقی کو سرمایہ دارانہ نظام سے الگ کر کے معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی مسائل کا حل ڈھونڈتی ہے۔ یہ گروہ ماحولیاتی مسائل اور غربت مٹاؤ (یعنی معاشرتی مسائل) کے لیے روایتی کھیتی باڑی اور پائیدار زراعت کو ایک جانتے ہیں۔ یہ گروہ سرمایہ دار مارکیٹ پر انحصار کو غلامی اور محتاجی سے جوڑتے ہوئے معاشرے کی پائیدار ترقی کے لیے ایک نیا رخ دیکھتے ہیں جو کہ خود انحصاری کو بنیاد بناتا ہے۔

یہ لابی دراصل غربت مٹاؤ کی لابی سے زیادہ جڑی ہوئی ہے۔ غربت مٹاؤ لابی تیسری دنیا کی لابی میں زیادہ نظر آتی ہے اور ظاہر ہے تیسری دنیا کی عوامی گروہ میں سب سے زیادہ مضبوط ہے۔

کاروباری یا بزنس کمیونٹی اشرافیہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ اسی طرح سائنس کمیونٹی زیادہ تر بزنس کمیونٹی کا ہی ساتھ دیتی ہے۔ موجودہ سائنس سرمایہ داری نظام کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ کئی طرح کی نئی ٹیکنالوجیاں چاہیے وہ انرجی شعبے سے ہوں یا ذرائع ابلاغ سے دراصل سرمایہ اور منافع بڑھانے کے لیے استعمال کی جارہی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پسماندہ عوام کی بہتر صحت یا غذا کی فراہمی یا غربت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے سرمایہ دار اپنا نقصان کر بیٹھے۔ سائنس دان طبقہ اپنی خدمات بے لوث نہیں دیتا۔ سرمایہ دار کمپنیوں کے ساتھ مل کر مہنگی سے مہنگی ٹیکنالوجی ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے زیر سایہ بھاری منافع حاصل کرتے ہوئے بیچی جاتی ہے۔ اس طرح ان گروہوں میں ایک یقینی ٹکراؤ موجود ہے۔ اسی طرح میجر گروپس میں مزدور/ٹریڈ یونین، کسان، عورتیں، نوجوان و بچوں اور مقامی لوگوں کے گروپس میں زیادہ خود انحصاری پر یقین رکھنے والے اور اصلاح پسند گروہوں کی زیادہ طاقت نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود کسان اور نوجوانوں میں سرمایہ دار لابی نے بھی اپنے حمایتوں کو متحرک کیا ہوا ہے۔ خاص کر کے کسان گروپ میں زرعی بین الاقوامی کمپنیوں نے اپنے نمائندوں کو بڑی منصوبہ بندی سے یہاں پر بھیجا ہوا ہے۔ افریقہ اور ایشیاء کے کئی پلیٹ فارم سے ایسے کسانوں کو بیٹھایا ہوا ہے جو کہ کارپوریٹ زراعت کی کسان پلیٹ فارم سے تشہیر کررہے ہیں۔ جہاں پر سرمایہ داری نظام کی سیاست کھل کر سامنے آرہی تھی وہاں پر پدرشاہی نظام بھی پورے زور وشور سے اپنے آپ کو متحرک کیے ہوئے تھا۔ عورتوں کی لابی میجر گروپس میں کافی مضبوط تھی۔ اس گروہ میں بھی سیاسی پس منظر میں تینوں لابیاں موجود تھیں یعنی لبرل سوچ، اصلاح پسند اور پھر انقلابی یا خود انحصاری گروہ۔ معاشرتی مسائل کے تحت کوشش کی جارہی تھی کہ عورتوں کے لیے بہتر صحت اور اس سے جڑی ہوئی ٹیکنالوجیوں تک رسائی عام ہو۔ ماحولیاتی بقاء کے لیے پہلی دنیا کی ریاستیں اور عوام کا خیال ہے کہ تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول ہونا چاہیے۔ جس کی وجہ سے عورتوں کے لیے جنسی اور تولیدی حقوق (Sexual and reproductive rights) پر زور دیا جارہا تھا۔ اس نقطہ نظر سے خود انحصاری لابی یقین نہیں رکھتی کیونکہ فی الوقت پہلی دنیا کی آبادی جو کہ دنیا کی کل آبادی کا 1/3 حصہ ہے دنیا کے کل قدرتی وسائل کا 2/3 حصے کا استحصال اور استعمال کررہے ہیں۔ اس لیے تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی دراصل ماحولیاتی وسائل کے استحصال کے ذمہ دار نہیں بلکہ خود پہلی دنیا کے باسی اور ان کی پرتعیش طرز زندگی ماحولیاتی کی بقاء کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ دیگر گروہوں جن میں عورتوں کا گروہ بھی اس حق پر زور دے رہا تھا لیکن ان کی وجوہات دوسری تھیں۔ عورت اگر زیادہ بچے پیدا کرتی ہے اور بچوں میں وقفہ نہیں ہے تو اس کی صحت پر شدید نقصان پڑتا ہے۔ اس طرح وہ دیگر معاشرتی اور معاشی عمل میں مکمل طور پر حصہ نہیں لے سکتی۔ ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی تربیت اور خاص کر غذائیت فراہم کرنے کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں نبھا سکتی۔ کمیونٹی میں اس کی اپنی ذات بھی مسخ ہوکر رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے آبادیوں کی ترقی اور بقاء میں اس کے کلیدی کردار پر بھی شدید وار پڑتا ہے۔ دیکھنے میں آیا کہ عورتوں کے جنسی اور تولیدی حقوق کی مخالفت سب سے زیادہ تیسری دنیا کی کئی ریاستوں سے ابھر کر سامنے آئی۔ اس کے علاوہ ویٹیکین (Vatican) جو کہ کیتھولیک چرچ کی سربراہی کرتا ہے نے بھی اس حق کی شدید مخالفت کی۔ پہلی دنیا کے ممالک جو کہ اس مسئلہ پر ایک مثبت کردار ادا کرسکتے تھے نے بھی سرد رویہ اختیار کیے رکھا۔ اس ضمن میں عورتوں کے صحت سے جڑے ہوئے ایک نہایت اہم مسئلے پر یا تو خاموش رہے یا پھر بہت سطحی درجہ کی مخالفت کی۔ یقیناً پائیدار ترقی عورتوں کے تمام حقوق کی مکمل حفاظت کے بغیر ممکن ہی نہیں میجر گروپس میں بھی دیکھا گیا کہ اس مسئلے میں سب سے زیادہ تعاون عوامی گروہ نے کیا اور دیگر گروہ جن میں بزنس اور سائنسی کمیونٹی شامل تھی نے دلچسپی نہیں لی۔

میجر گروپس میں پائے جانے والی تفریق عوامی گروہوں کے لیے شدید خطرے کا باعث ہیں۔ دی فیوچر وی وانٹ کا مسودہ اپنے پانچویں باب ''لائحہ عمل برائے کاروائی اور تسلسل'' (فریم ورک فار ایکشن اینڈ فولواپ) کے سیکشن بی میں پائیدار ترقی کے گولز (ہدف)

کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہاں پر ملینیم ڈیولپمنٹ گولز کا ذکر کرتے ہوئے آگے آنے والی تدبیروں پر عمل کاری کے لیے لائحہ عمل کا منصوبہ پیش کیا گیا ہے۔

2000 میں ملینیم ڈیولپمنٹ گولز کو تشکیل دیا گیا تھا۔ ان کو اکثر ایم ڈی جیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایم ڈی جیز میں مندرجہ ذیل دیے ہوئے ترقیاتی مقاصد شامل ہیں۔

1۔ انتہائی غربت اور بھوک کا خاتمہ۔
2۔ تمام بچوں کے لیے عالمی بنیادی تعلیم کا حصول۔
3۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کا فروغ اور عورتوں کا مجاز بڑھانا۔
4۔ بچوں میں اموات کی شرح کم کرنا۔
5۔ مادرانہ صحت میں بہتری۔
6۔ ایچ آئی وی/ایڈز، ملیریا اور دیگر بیماریوں سے لڑائی یا کمی واقعہ کرنا۔
7۔ پائیدار ماحول کا حصول۔
8۔ ترقی کے لیے عالمی پارٹنرشپ حاصل کرنا۔

2015 میں ایم ڈی جیز کا پورا ہونے کا مقرر وقت ختم ہو جائے گا۔ ریو پلس 20 میں یہ طے پایا ہے کہ بین الاقوامی کمیونٹی ایم ڈی جیز کے ختم ہونے کے بعد آگے کے لیے سسٹینیبل ڈیولپمنٹ گولز کی تعریف وضع کرے۔ یعنی پائیدار ترقی حاصل کرنے کے لیے معیار قائم کرے اس حوالے سے اب یہ کوشش جاری ہے کہ کل عوام جس میں کسان، دیہی اور شہری مزدور، ماہی گیر، مقامی آبادیاں (indigenous people)، چرواہے، عورتیں، نوجوان اور دیگر طبقات اپنے اپنے حوالے سے اپنے لیے پائیدار ترقی حاصل کرنے کے لیے چیدہ چیدہ بنیادی نقاط کی نشاندہی کریں۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان میں کسان آبادیاں اور دیگر گروہ اس عمل میں کیسے حصہ لیں؟ سب سے پہلے تو ضرورت یہ ہے کہ عوام میں پائے جانے والے یہ سارے گروہ فیصلہ سازی کے عمل سے گزریں۔ پھر انہیں کونسی سیاسی سوچ کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑنا ہے اس کا فیصلہ کریں۔

چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے لیے بھی اس فیصلہ سازی میں حصہ لینا نہایت اہم ہے۔ پاکستان میں پسے ہوئے طبقوں میں سب سے زیادہ مسائل کا شکار یہی طبقہ ہے۔ بڑھتی ہوئی شدید مہنگائی کا نتیجہ ہے کہ نا صرف یہ طبقہ زرعی پیداوار میں حصہ لے کر بڑے پیمانے پر قرضوں میں ڈوب چکا ہے بلکہ ساتھ ساتھ ماحولیاتی بحران کی وجہ سے ہر سال کسی نا کسی نئی ''قدرتی'' آفت میں گھر کر مزید تباہی سے دوچار ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جو طبقہ ساری دنیا کے لیے غذا اگاتا ہے وہ خود اپنے لیے دو وقت کی بہتر غذا حاصل نہیں کر پاتا۔ اس طبقہ میں سب سے زیادہ بھوک اور افلاس پائی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسان طبقہ اپنے لیے کونسا نظام کا چناؤ کرے گا۔ کیا کارپوریٹ/سرمایہ دار زراعت کا؟ یہ وہی نظام ہے جس نے ماحولیاتی آلودگی کو اس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ پاکستان اب ہر سال بارشوں، سیلاب اور طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

زہریلی کھاد اور اسپرے سے ہماری زمین بنجر ہو چکی ہے۔ ٹیوب ویل کے بے تحاشہ استعمال سے پاکستان میں زرعی پانی کی قلت ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ سبز انقلاب ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کے لیے کسان قرض میں ڈوبتا جا رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے چکر میں پھنس کر نہ اپنے لیے صحت مند غذا کا حصول ممکن بنا رہا ہے اور نہ ہی قرض سے چھٹکارہ حاصل کر پا رہا ہے۔

ایک طرف کارپوریٹ زراعت زمین کی زرخیزی ختم کر رہی ہے تو دوسری طرف یہ نظام ہماری حکومت کو آزاد تجارت اور نجکاری کے اصولوں کو سیکھاتے ہوئے عوام کو کسی بھی قسم کی مراعات فراہم کرنے سے روک رہی ہے۔ پبلک پرائیوٹ پارٹنرشپ کے تحت تعلیم، انسانی ادویات، صحت کی دیگر سہولیات، ٹرانسپورٹ یا زندگی کی دیگر ضرورتیں سب منڈی میں مہنگی قیمتیں ادا کرنے کے بعد حاصل ہو سکتی ہیں۔

کسان آبادیوں کے لیے سرمایہ داری نظام کی اس چال کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے باشعور کسان آبادیوں کے لیے ضروری ہے کہ کسی منظم پلیٹ فارم کے تحت اپنے لیے پائیدار ترقی کے اصولوں کو وضع کریں اور حکومتی ایوانوں تک پہنچائیں۔ اب کئی سالوں سے باشعور کسان خوراک کی خودمختاری کے پلیٹ فارم کے گرد اپنے آپ کو جمع کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں متحرک کارکنان کی ذمہ داری ہے کہ اس پلیٹ فارم تک زیادہ سے زیادہ مرد و عورت کسانوں کو پہنچائیں تاکہ یہ ایک با اثر گروپ کی شکل میں سامنے آئے۔ جدوجہد کے کئی راستے ہیں۔ ان میں شامل کسان آبادیوں کی آگہی کے علاوہ میڈیا تک اپنی آواز پہنچانا شامل ہے۔ کسان دوست گروہوں کی یہ پر زور کوشش ہونی چاہیے کہ کسان نا صرف اپنی بلکہ ملک بھر کی غذا خود انحصاری کی بنیاد پر اگانے کی طرف اقدام اٹھائے۔ سائنسی تحقیق یہ دلائل دیتی ہے کہ موسمی بحران سے نمٹنے کے لیے روایتی کھیتی باڑی سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اگر خوراک کی خودمختاری کے اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے کسان اپنی بیجوں کو دوبارہ سے کاشت کرنا شروع کر دیں اور گوبر اور قدرتی کھاد کے دوسرے ذرائع پر انحصار شروع کر دیں تو یقیناً وہ اپنے معیار زندگی کو کئی حوالوں سے بہتر کر پائیں گے۔ جس میں صاف ستھری صحت مند غذا، قرض سے چھٹکارا اور ماحولیاتی بحران سے لڑنے کے لیے طریقے کار شامل ہیں۔ آخر میں یہ نقطہ نظر ڈالنا ضروری ہے کہ کسان گروہوں کو صرف اپنی آبادیوں تک ہونے والی ماحولیاتی بحران اور معاشی اور سماجی مسائل کے لیے حل نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ کسان آبادیوں کے مسائل کی اصل وجہ سرمایہ داری نظام ہے جو کہ اپنی صنعتی پیداوار سے حاصل کیے جانے والے منافع کے تحت نا صرف معاشی بحران بلکہ ماحولیاتی بحران کا ذمہ دار ہے۔ جب تک عوام اور خاص کر کے کسان آبادیاں سامراجی پالیسیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھائیں گی اور عالمی سطح پر پائیدار ترقی حاصل کرنے کے لیے اس طرز زندگی کو چیلینج کرتے ہوئے اس کو بدلنے کی ذمہ داری نہیں نبھائیں گی وہ بار بار ماحولیاتی و معاشی و غذائی بحران کا سامنا کریں گی۔ پائیدار ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم موسمی انصاف کے نعرہ کو بھی بڑے پیمانے پر اٹھائیں اور پہلی دنیا سے آنے والی ہر طرح کی سامراجی سوچ و لائحہ عمل کو رد کرتے ہوئے خود انحصاری کو مکمل طور پر قبول کر لیں۔

سبز معیشت اور توانائی کے متبادل ذرائع

تحریر: ارشاد سومرو

صنعتی نظام کی بنیاد زیر زمین ایندھن (تیل، کوئلہ اور گیس) یا براؤن ایکانومی پر ہے۔ ایک طرف منافع کو بڑھانے کے لیے اس نظام نے تیز رفتار صنعتی پیداوار کے ذریعے ان وسائل میں تیزی سے کمی واقع کردی ہے تو دوسری جانب زیر زمین ایندھن کے بے تحاشہ استعمال سے کاربن گیسز کے اخراج کی وجہ سے ماحولیاتی آلودگی اور موسمی بحران جیسے مسائل سامنے آئے ہیں جن سے اب دنیا کی آبادیوں کو تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تیل کی کمی کی وجہ سے صنعتی ممالک اپنی صنعت کی بقا کی خاطر متبادل راستے تیار کر رہے ہیں جس کے لیے وہ اپنی ہی پھیلائی ہوئی ماحولیاتی تباہیوں کو جواز بنا کر پیش کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ زیر زمین ایندھن کا استعمال کم از کم کرنا ہوگا کیونکہ یہ گرین ہاؤس گیسز کی بڑھتی ہوئی مقدار، فضائی آلودگی اور ماحولیاتی حادثات کا سبب بنتی ہیں۔ پہلی دنیا جو کاربن اخراج کی سب سے زیادہ ذمہ دار ہے وہ پالیسی سازی کے ذریعے توانائی کے متبادل ذرائع (ونڈمل، سولر انرجی، ہائیڈرو انرجی، ایٹمی انرجی، جیوتھرمل انرجی اور ایگرو فیول یعنی فصلوں سے حاصل کیے جانے والے ایندھن) جیسے شعبہ جات یا گرین ایکانومی میں سرمایہ کاری کو تیسری دنیا میں فروغ دے رہی ہے۔

صنعتی ممالک نئی ٹیکنالوجیز کو اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کے سائے تلے فروغ دے رہے ہیں۔ جس کی شروعات 1972 میں اسٹاک ہوم (Stockholm) میں منعقد کی گئی ماحولیاتی کانفرنس سے ہوئی۔ 20 سال بعد 1992 میں برازیل کے شہر ریوڈی جینیرو میں ماحولیات اور ترقی پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جسے ارتھ سمٹ کہا جاتا ہے۔ ارتھ سمٹ کے 20 سال بعد ایک اور سربراہی اجلاس جون 2012 میں ایک مرتبہ پھر برازیل کے شہر ریوڈی جینیرو ہی میں منعقد کیا گیا۔ اس سربراہی اجلاس میں اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (UNEP) کی طرف سے جو مسودہ پیش کیا گیا تھا اس کا مقصد سبز معیشت کی بنیاد پر پائیدار ترقی اور غربت کے خاتمے کی طرف قدم بڑھانا تھا۔ سبز معیشت کے اس مسودے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ متبادل توانائی کے پروگرام کے ذریعے توانائی کے ان نئے شعبہ جات میں بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع کے ساتھ دنیا بھر میں لاکھوں کی تعداد میں ملازمتوں کے مواقع ممکن ہوں گے۔ توانائی کی نئی ٹیکنالوجیز میں سرمایہ کاری کرنے سے منافع کی شرح میں اضافہ ہوگا اور توانائی کے نئے ذرائع سے حاصل کی گئی توانائی زیر زمین ایندھن کی بنسبت سستی ہوگی، اس سے توانائی کا تحفظ بھی یقینی ہوگا۔ لیکن متبادل توانائی کے حصول میں کی گئی اس پیش رفت میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ توانائی کے ان نئے ذرائع کا استعمال، بٹوارہ، ترسیل اور قبضہ کس کے ہاتھ میں ہوگا؟

وسائل پر اجارہ داری

توانائی کے روایتی پیداواری ذرائع پر دنیا کی بڑی بڑی سرمایہ کار کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہے۔ یہ کمپنیاں نہ صرف توانائی کی پیداوار پر قابض رہتی ہیں بلکہ بجلی کے یونٹس کے نرخ کو بھی خود طے کرتی ہیں۔ موجودہ نظام کے تحت توانائی کی پیداوار ایک مرکزی جگہ کی جاتی ہے جس کے تمام انتظامات، وسائل، پیداوار، ترسیل، قیمت وغیرہ ان نجی کمپنیوں یا کارپوریشن کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق پیداوار کم یا زیادہ اور ترسیل یا نرخ طے کرتی ہیں۔ توانائی کے وسائل پر اجارہ داری کے اس نظام میں پیداوار اور ترسیل میں فاصلہ رکھا جاتا ہے تاکہ قبضہ برقرار رہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ پلانٹ جہاں پیداوار ہوتی ہے اور جہاں سے توانائی کی ترسیل کی جاتی ہے ان مقامات کو آبادیوں سے فاصلے پر رکھا جاتا ہے تاکہ عوام توانائی کی پیداوار اور ترسیل کے سلسلے میں خلل یا قبضہ نہ کرسکیں اور کمپنیوں کی اجارہ داری قائم رہے۔

وسائل پر قبضے کے اس نظام کو عالمی تجارتی ادارے اور عالمی بینک کی طرف سے بنائے گئے ٹرپس یا ذہنی ملکیت جیسے معاہدوں کے ذریعے بھی سہارا دیا جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو توانائی پیدا اور ترسیل کی جگہ الگ کردی گئی۔ اس کے علاوہ ٹیکنالوجی کو بھی ذہنی ملکیت کے ذریعے کمپنیوں نے نہ صرف پیداوار پر قبضہ جمایا ہوا ہے بلکہ اس ٹیکنالوجی کو کسی اور کو بنانے کی جگہ نہیں دیتے۔ اسی طرح متبادل توانائی کی ٹیکنالوجیز سولر انرجی، ونڈ انرجی وغیرہ کو بھی نجی کمپنیاں ذہنی ملکیت کے معاہدے کے تحت اپنے نام کریں گی۔ اس وقت دنیا بھر میں مختلف نجی کمپنیوں کے سولر پینل اور دیگر اشیا فروخت ہو رہے ہیں جو گھروں، دفتروں اور دیگر کاروباری جگہ پر لگائے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی نجی بیرونی کمپنیاں ونڈمل کے فارم لگا رہی ہیں جو کہ بجلی کے پیداوار، ترسیل اور نرخوں کو اپنے قبضے میں رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق آبادیوں کو بجلی فراہم کریں گی۔ وسائل پر اجارہ داری کا یہ موجودہ نظام اپنی غیر شفافیت کے ساتھ ساتھ غیر موثر اور غیر پائیدار بھی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف آبادیوں کو توانائی کے حصول میں دشواریاں پیش آتی ہیں بلکہ انہیں قیمتوں کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ توانائی کے اس طریقہ کار کی وجہ سے دنیا کے 2 بلین لوگ توانائی کے حصول سے محروم ہیں[1]۔

موسمی تبدیلی کے حوالے سے ایک اور متبادل ذریعہ توانائی ایگرو فیول ہے۔ ایگرو

فیول فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے زیادہ پیداوار دینے والے بیج، کیمیائی کھاد، زہریلی ادویات کے استعمال کی ترغیب کے ساتھ جنگلات کی کٹائی کر کے زیادہ زمین حاصل کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بڑی بڑی مشینوں سے زمین کے وسیع رقبوں پر فصلوں کی کاشت سے نہ صرف ماحولیاتی آلودگی پھیلتی ہے بلکہ کسانوں کی زمینوں سے بے دخلی، بے روزگاری اور خوراک کا بحران بھی پیدا ہوتا ہے۔ اگر صرف 8-2007 کے دوران خوراک کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ 8-2007 میں زرعی ایندھن (ایگروفیول) کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ خوراک کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ امدادی ادارے آکسفیم کے مطابق جی 8 ممالک کی طرف سے ایگروفیول کی پالیسیاں دنیا کے 75 فیصد لوگوں کو مسائل میں مبتلا کر رہی ہیں[2]۔

سرمایہ کاری کے ہتھکنڈے

متبادل توانائی کی اشیاء اور ٹیکنالوجیز کو تیسری دنیا کے ممالک میں متعارف کروانے کے لیے سرمایہ دار اور صنعتی ممالک کئی طرح کی حکمت عملیوں پر عملدرآمد کروانے کے لیے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی مدد حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح پرائیویٹ پبلک پارٹنرشپ (PPP) کے ذریعے نجی کمپنیوں سے سرمایہ کاری کروائی جاتی ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے، عالمی بینک وغیرہ کی مدد سے تیسری دنیا کے ممالک میں سیاسی رسفارتی طریقوں کے ذریعے مختلف فنڈز متعارف کروائے جاتے ہیں اور ان فنڈز کو حاصل کرنے کے لیے حکومتی سطح پر بنائی گئی پالیسیوں میں ردوبدل کرنا پڑتا ہے تاکہ غیر ملکی کمپنیوں کے لیے سرمایہ کاری کا راستہ ہموار ہو سکے۔ مثلاً فلپائن نے اپنی توانائی پالیسی 2008 میں غیر ملکی سرمایہ کار کمپنیوں کو کئی طرح کے مالیاتی اور غیر مالیاتی فائدے دے رکھے ہیں جن کے ذریعے متبادل توانائی کے شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کار نجی کمپنیوں کو 7 سال ٹیکس فری چھوٹ دی گئی ہے اور دس سال تک ان ٹیکنالوجیز کے پرزوں کے درآمد کو ڈیوٹی فری قرار دیا گیا ہے[3]۔

اسی طرح ان سرمایہ دار ممالک کی طرف سے تیسری دنیا کے ممالک میں متبادل توانائی (Renewable Energy) کے شعبوں میں صلاحیتیں بڑھانے کے نمائشی اور تربیتی پروگرام بھی کیے جاتے ہیں تاکہ متبادل توانائی کی ٹیکنالوجیز کو فروغ دیا جا سکے۔ اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے عالمی بینک نے بھی موسمی سرمایہ کاری فنڈز دے کر کارپوریٹ شعبہ کی موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی بچاؤ کے ڈھکوسلے استعمال کرنے کی جگہ دے دی ہے[4]۔ عالمی بینک نے اس کام کی شروعات 2007 میں کی تھی۔ بینک نے تازہ ترین دستاویز اسٹریٹیجک فریم ورک آن کلائیمٹ چینج اینڈ ڈیولپمنٹ (SFCCD) کے ذریعے موسمی سرمایہ کاری فنڈ (CIF) متعارف کروائے ہیں[5]۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ گرین ہاؤس گیسز کے بڑھتے ہوئے اخراج میں عالمی بینک جیسے ادارے بھی ملوث رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈبلیو ڈبلیو ایف یو کے (WWF-UK) کے مطابق 1997 سے 2007 تک عالمی بینک نے تیل کوئلے، گیس اور ڈیمز کے مختلف پروجیکٹس میں مالی امداد فراہم کیں۔ ان ''ترقیاتی کاموں'' سے 26 گیگا ٹن کاربن کا اخراج ہوا جو کہ برطانیہ کے سالانہ کاربن اخراج سے 45 گنا زیادہ ہے اور اس مرتبہ عالمی بینک کی طرف سے جو موسمی امداد دی جائے گی وہ بڑے پیمانے پر توانائی کے نجی شعبے پر مبنی ہوگی[6]۔

پاکستان میں توانائی کے صورتحال اور بیرونی سرمایہ کاری

عالمی نیولبرل ایجنڈے کو فروغ دیتے ہوئے پاکستان نے بھی نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کی ہے جس کے تحت ملک کے درجنوں ادارے بشمول پی ٹی سی ایل، کے ای ایس سی اور بینک وغیرہ کی نجکاری کر دی گئی ہے۔ مالی سال 12-2011 کے معاشی سروے کے مطابق ملک میں توانائی کی عدم دستیابی کی وجہ سے ملکی پیداوار مستقل تناؤ کا شکار رہی۔ ملک میں موجود توانائی کے بحران کے حوالے سے ندیم حسین روزنامہ دی نیوز میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''حکومت پاکستان نے مالی سال 13-2012 میں جی ڈی پی (GDP) کا ہدف 4.3 فیصد لگایا تھا لیکن توانائی کی مسلسل کمی کی وجہ سے جی ڈی پی کا حصول کم رہا۔ پاکستان میں توانائی کے تین بڑے ذرائع ہیں: تھرمل پاور جس سے 65.3 فیصد توانائی حاصل کی جاتی ہے، پن بجلی جس سے 31.6 فیصد توانائی حاصل کی جاتی ہے اور نیوکلیئر توانائی سے 3.1 فیصد توانائی حاصل ہوتی ہے۔ حکومتی ذرائع کے مطابق سال 12-2011 کے مارچ سے جولائی تک توانائی کی ضرورت 18,860 میگاواٹ تھی جبکہ رسد 12,755 میگاواٹ رہی اور خسارہ 6,000 میگاواٹ تھا۔ ملک کی 162 ملین آبادی میں سے صرف 60 فیصد آبادی کو توانائی تک رسائی حاصل ہے''[7]۔

اگر دیکھا جائے تو پاکستان میں بجلی کا موجودہ سنگین بحران بجلی کے شعبے کی نجکاری کے بعد ہوا۔ اس کی شروعات بے نظیر بھٹو کہ پہلے دور حکومت سے ہوئی اور پھر ہر حکومت اس مسئلے میں پھنستی چلی گئی۔ اب ملک میں بجلی کا بحران ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا اور موجودہ وزیراعظم راجہ پرویز اشرف پر رینٹل پاور پلانٹس میں خرد برد کرنے کی بنیاد پر 22 ملین روپے کا الزام سامنے آیا ہے۔

پاکستان دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جو قدرتی اور معدنی وسائل سے مالا مال ہے۔ ملکی توانائی کی پیداوار اور کھپت کو دیکھا جائے تو پاکستان دیگر صنعتی ممالک امریکہ، چین، جاپان، انگلینڈ، ہندوستان وغیرہ کے کاربن اخراج کے بنسبت توانائی کے استعمال کے مد میں صرف 0.8 فیصد کاربن کا اخراج کرتا ہے جو کہ بہت کم ہے[8] لہذا پاکستان کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ ملکی ترقی کے لیے توانائی کے حصول کی خاطر اپنے قدرتی وسائل کو استعمال کرے۔ یہاں اس بات کو دہرانہ ضروری ہے کہ دنیا میں موسمی اور ماحولیاتی بحران مغربی صنعتی ممالک کے زیادہ کاربن کے اخراج کرنے کی وجہ سے ہو رہا ہے نہ کہ ترقی پزیر ممالک کی وجہ سے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 185.5 بلین ٹن کوئلے کے ذخائر موجود ہیں اور ملکی توانائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پاکستان کوئلے کے ان ذخائر کو استعمال کر سکتا ہے۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق کوئلے کے ان تمام ذخائر سے 30 سال تک ایک

لاکھ میگاواٹ بجلی کی پیداوار ممکن ہے۔ ملک کے نامور سائنس دان ڈاکٹر ثمر مبارک مند کے مطابق تھر کے کوئلے سے 50 سے 80 ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے[9] لیکن پاکستان بورڈ آف انویسٹمنٹ (BoI) کی ایک پبلک ایکاؤنٹس کمیٹی نے کہا ہے کہ حکومت کو تھر کے کوئلے سے بجلی بنانے کے لیے چھ بلین ڈالرز زرِ قم کی ضرورت پڑے گی۔ حکومت کے پاس اتنی رقم نہ ہونے کی وجہ سے کوئلے کے ان ذرائع میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے نجی کمپنیوں کی طرف دیکھا جارہا ہے جس کے لیے نجی پاور پالیسی بنائی گئی ہے۔

پاکستان میں متبادل سرمایہ کاری کرنے کے لیے جرمنی کی ترقیاتی بینک کے ڈبلیو ایف (KWF) نے 40 سال کے لیے 800 ملین یوروز کی سرمایہ کاری کی ہے۔ بینک کی صدر ڈاکٹر بنکے (Dr. Janke) کے مطابق بینک کی اولین ترجیح ہائیڈرو پروجیکٹس (پن بجلی) کے منصوبوں میں سرمایہ کاری ہے جس کے لیے بینک نے 97 ملین یوروز لگا رکھے ہیں[10]۔ عالمی بینک، ایشین ڈیولپمنٹ بینک اور دیگر مالیاتی ادارے پاکستان میں ڈیمز کے ذریعے پن بجلی بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کررہے ہیں لیکن ان منصوبوں کے ساتھ ماحولیاتی تباہ کاریوں کے علاوہ لوگوں کی زمین سے بے دخلی اور صوبوں کے مابین سیاسی اختلاف بھی شامل ہوجاتے ہیں۔

اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ کوئلے سے توانائی کی پیداوار سے ہٹ کر ڈیمز کے ذریعے بجلی کی پیداوار میں کیوں سرمایہ کاری کی جارہی ہے؟ کونسی ایسی طاقتیں ہیں جو توانائی کے پیداواری وسائل میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں اور کن ذرائع میں سرمایہ کاری نہیں کرنا چاہتیں اور ان کے ایسا کرنے میں کونسے مفادات وابستہ ہیں؟ ملک میں موجود 6 ہزار میگاواٹ بجلی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے پڑوسی ملک ایران سے سستے نرخوں میں توانائی کا حصول ممکن ہے لیکن حکومت پاکستان واشنگٹن کے دباؤ کی وجہ سے ایران کے ساتھ توانائی کے شعبوں میں پیش رفت نہیں کرپارہی ہے۔

ملک میں متبادل توانائی کے ذرائع کا بڑے زوروشور سے پرچار ہورہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ پاکستان میں توانائی کے متبادل ذرائع اس کمی کو پورا کرسکتے ہیں اور حکومت پاکستان نے 2030 تک توانائی کا 5 فیصد متبادل ذرائع سے حاصل کرنے کا ہدف رکھا ہے جس کے لیے نجی شعبے کی طرف دیکھا جارہا ہے[11]۔ اسی ضمن میں نجی شعبے اور بیرون ملک سرمایہ کاروں کے لیے مندرجہ ذیل مراعات دی گئی ہیں: ونڈ فارم کے لیے صرف 7 یورو فی ایکڑ زمین، سالانہ ٹیرف کی چھوٹ، ونڈ فارم سے پیدا کی جانے والی بجلی کی یقینی خریداری، سیاسی رسک سے تحفظ، آلہ جات کی ڈیوٹی فری درآمد اور تمام ٹیکسیس سے چھوٹ وغیرہ[12]۔ اسی سلسلے میں اب تک تقریباً 18 نجی کمپنیوں کو گھارو، بھمبور، جھمپیر اور کٹی کن کے علاقوں میں ونڈمل کے منصوبے لگانے کی اجازت دی جاچکی ہے[13]۔

وسائل پر مقامی دسترس

اس بات میں کوئی شک نہیں کے صنعتی ممالک کی وجہ سے تیسری دنیا کی آبادیاں موسمی تبدیلی، سیلاب، قحط، غربت اور خوراک جیسے مسائل کا سامنا کررہی ہے۔ چونکہ ترقی یافتہ ممالک ہی گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج میں ملوث ہیں لہذا انہی کو سب سے زیادہ ہرجانہ بھی ادا کرنا چاہیے لیکن اس کے برعکس صنعتی ممالک اپنے سرمایہ کو تحفظ دینے کے لیے ماحولیاتی بچاؤ کی آڑ میں ذہنی ملکیت کے معاہدوں کی اجارہ داری کے ذریعہ بے تحاشہ منافع کماتے ہوئے اسے فروخت کریں گے۔

عوام دوست سائنسدانوں اور انجینئرز کا خیال ہے کہ توانائی کی پیداوار، رسد، بٹوارے اور کھپت کے پرانے طریقہ کار کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ مرکزی پیداواری سسٹم کو نجی کمپنیوں کی اجارہ داری سے ہٹا کر مقامی آبادیوں کے حوالے کیا جانا چاہئے۔ اس طرح یہ نظام بہتر انداز میں، جامع اور پائیدار طریقہ کار پر عمل پیرا ہوسکے گا۔ مثلاً سولر اور ونڈ انرجی سے توانائی کی پیداوار کے لیے بڑے بڑے پلانٹ لگانے کے بجائے، اگر یہ مقامی آبادیوں میں مقامی سطح پر لوگوں کے حوالے کیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ اس طرح ان مقامی آبادیوں کا اپنے وسائل پر مشترکہ حق، ان کی پیداوار، رسد اور کھپت ان کے پاس رہے گی۔ ماہرین کا یہ بھی ماننا ہے کہ ان تمام مسائل کے حل کے لیے بڑے سیاسی اور معاشی فیصلے کرنے کی ضرورت ہے جس سے موثر طریقے سے توانائی کے متبادل ذرائع اور دیگر ٹیکنالوجیز عوامی اور مقامی سطح تک منتقل ہوسکیں گے۔

حوالہ جات

1۔ John Paul Corpus, "Using ODA to promote CDM", Strengthening the People's Movement on Climate Change, EDM, IBON, Vol. 8, No. 6, November - December, 2009, p.6.

2۔ ارشاد سومرو، ''ایگروفیول کی پیداوار: موسمی بحران کا حل یا منافع کی ہوس''، روٹس فار ایکوٹی، چیلنج، جلد 4، شمار 1، جولائی تا ستمبر 2011، صفحہ 7۔

3۔ *Op.cit.*, p.16.

4۔ "What is wrong with the World Bank as "Climate Banker" Reality Check", EDM, IBON, April, 2009. p.12.

5۔ ایضاً، صفحہ 12۔

6۔ ایضاً، صفحہ 13۔

7۔ Nadim Hussain, "Green economy revolution", The News, 11 June 2012, p.1.
http://dawn.com/2012/04/28/rental-power-projects-nab-considering-plea-bargain-to-recover-money/

8۔ "World Carbon Emissions", The League Table of Every Country" The Guardian: accessed from http://www.guardian.co.uk/environment/datablog/2012/jun/21/world-carbon-emissions-league-table-country

9۔ Murtaza Haider, "From Thar coal to utility poles: Power politics in Pakistan", Dawn, 19 September, 2012: accessed from http://dawn.com/2012/09/19/from-thar-coal-to-utility-poles-power-politics-in-pakistan/

10۔ "Energy: Reunification Day of Germany; Report", Dawn, Advertisement supplement, 3 October, 2012, p.13.

11۔ "World Carbon Emissions", The League Table of Every Country" The Guardian: accessed from http://www.guardian.co.uk/environment/datablog/2012/jun/21/world-carbon-emissions-league-table-country

12۔ "Incentives by Government for Wind Power Project Development in Pakistan", accessed from http://aedb.org/invtopp.htm

13۔ Land Allocation to Wind Power IPPs: accessed from http://www.aedborg/currstatus.htm

سندھ میں غریب کسان کے استحصال کے خلاف پہلی آواز

تحریر: طارق حسین

آج کے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا شکار عوام میں ایک نعرہ سننے کو ملتا ہے کہ ''جو بوئے، وہ کھائے''۔ بظاہر یہ چند الفاظ یا چھوٹا سا جملہ ہے، مگر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چند الفاظ اپنے اندر ایک الگ دنیا اور نظام معیشت لیے ہوئے ہے۔ سندھ کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ نعرہ ایک طویل تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نعرہ سندھ میں غریب کسان کے استحصال کے خلاف پہلی آواز تھی جو آج سے 300 سال پہلے سندھ کے عظیم صوفی شاعر اور سماجی فلسفی صوفی شاہ عنایت شہید نے اٹھائی۔ یہ وہ دور تھا جس وقت سندھ میں جاگیرداری نظام اپنے عروج پر تھا اور سندھ خاص طور پر ٹھٹھہ کے کسان معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ اس وقت سندھ کے اس عظیم صوفی جس کو آج کے تاریخ داں اور محقق سندھ کا سوشلسٹ صوفی بھی کہتے ہیں 1 کسانوں کی خستہ حالی دیکھتے ہوئے جاگیردار اور حکمراں طبقے کی طرف سے ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں سندھ کے کسانوں میں شعور بیدار کیا کہ وہ جس زمین پر کام کرتے ہیں، جس پر بیج بوتے ہیں، فصل اگاتے ہیں، ہل چلاتے ہیں اور دن رات مشقت کرتے ہیں، اس زمین پر اس کی پیداوار پر ان کا حق ہے۔ کسانوں کے حقوق کے لیے شاہ عنایت نے زمینداروں کے خلاف آواز بلند کی جو کہ اس وقت کی استحصالی قوتوں کے مددگار تھے۔

سندھ کے اس صوفی کو اگر وقت سے آگے کا مفکر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ آپ نے اس معاشی نظام کی بات کی جسے دنیا نے دو صدیوں کے بعد: انقلاب فرانس میں دیکھا اور جو ہمیں کارل مارکس کی فکر میں نمایاں نظر آتا ہے۔

صوفیاء کرام کے حوالے سے ایک عام رائے پائی جاتی ہے یا یوں کہیں کہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ صوفیاء نے ہمیں روحانیت تزکیہ نفس اور خدا سے لو لگانے کی تلقین کی اور معاشرے کی استحصالی قوتوں کو چیلنج نہیں کیا مگر سندھ میں ہمیں ایک ایسے صوفی کا نام ملتا ہے جس نے ظلم و جبر اور استحصالی نظام پر صبر کی تلقین نہیں کی بلکہ اس نظام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ یہ صوفی شاہ عنایت تھے جنہوں نے کسانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان قربان کردی۔ ان کا تعلق ٹھٹھہ کے ایک علمی خانوادہ سے تھا۔ آپ جس عہد سے تعلق رکھتے ہیں وہ 17 ویں صدی عیسوی میں مغل حکمراں اورنگ زیب کا دور ہے جس میں سندھ مغل سلطنت کا صوبہ تھا۔ صوفی شاہ عنایت شہید کی زندگی کا بڑا حصہ حصول تعلیم میں گزرا اور اس کے لیے آپ نے برصغیر کے مختلف علاقوں کے طویل سفر کیے۔ یہ تقریباً 52 سال کی عمر میں حیدرآباد سے واپس ٹھٹھہ آئے۔ یہاں پر لوگوں نے آپ کی بیعت بھی کی اور انہوں نے قادری سلسلہ کو جاری کیا۔ صوفی شاہ عنایت کے دور میں ٹھٹھہ کے کسان معاشی بدحالی کا شکار تھے جس کی بڑی وجہ مرکز کی طرف سے مختلف محصولات تھے۔ ان محصولات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''سندھ خاموشی کی آواز'' میں لکھتے ہیں کہ مغل حکومت کی جانب سے کئی قسم کے محصولات مقرر کیے گئے تھے جو تاجروں، کسانوں اور عوام کو دینا پڑتے تھے۔ ان میں سے خاص خاص یہ تھے:

دھرت: یہ اناج، تیل، روئی پر لگایا گیا تھا اس کے نرخ ہر علاقے میں جدا جدا ہوتے تھے۔

2۔ دستور کشی و چہل یک: کشتی جو ساماں لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی اس کے سامان کا ایک چوتھائی محصول لیا جاتا تھا۔

3۔ بندرگاہ اور کسٹم کے محصولات

4۔ گاؤں شماری

5۔ مویشیوں پر داغ بندی۔ اس سے ان قبائل کو نقصان ہوتا تھا جس کا گزارا مویشیوں کی پرورش پر تھا۔

6۔ اورنگزیب کے زمانے میں جزیہ جو غیر مسلمانوں سے لیا جاتا تھا۔

اگرچہ ان میں سے کچھ محصولات مغل حکمرانوں کی جانب سے معاف کردیے گئے تھے مگر پھر بھی یہاں کے مقامی عہدے دار انہیں وصول کرتے تھے 2۔

جہاں تک جاگیردار طبقہ کا تعلق ہے وہ حکومت کا دست راست تھا اور تقریباً تین چوتھائی زمینیں اس کے قبضہ میں تھی۔ سبط حسن اس ضمن میں لکھتے ہیں ''بڑے بڑے جاگیردار شاذ و نادر ہی اپنی جاگیروں پر جاتے تھے۔ وہ خود شاہی دربار سے منسلک رہ کر آگرہ، دہلی اور لاہور میں عیش کی زندگی گزارتے اور جاگیر کی دیکھ بھال عاملوں کے سپرد کردیتے'' 3۔

اس صورتحال سے شاہ عنایت کو اندازہ ہوا کہ غریب کسان نچلے اور دبے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا بڑے پیمانے پر استحصال ہو رہا ہے۔ آپ کو یہ راز معلوم ہوگیا تھا کہ معیشت میں اصل چیز پیداواری عمل ہے۔ سید سبط حسن اپنی کتاب نوید فکر میں پیداواری عمل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اگر چند افراد کی ذاتی ملکیت ہو تو دولت کی مساوی تقسیم کیونکر ممکن ہوگی، اصل مساوات وہ ہے جو پیداواری عمل کے دوران قائم ہو نہ کہ تقسیم کے دوران، ورنہ چوروں اور ڈاکوؤں کا ٹولا بھی مال کو آپس میں بانٹ کر کھاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم پیداواری عمل میں مساوی شرکت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لہذا صوفی شاہ عنایت نے پیداواری عمل میں مساوی شرکت پر زور دیا'' 4۔ انہوں نے مزید کہا کہ کھیتی باڑی اجتماعی اصولوں پر کی جائے، پیداواری عمل میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں اور پیداوار کو حسب ضرورت آپس میں تقسیم کرلیں۔ یہ وہی بات ہے جسے آج کل خوراک کی خود مختاری (Food Sovereignity) میں کہا جا رہا ہے۔ صوفی شاہ عنایت کے مرید فقیروں نے یہ تجویز بخوشی منظور کرلی اور اجتماعی کھیتی باڑی میں مصروف ہوگئے۔

صوفی شاہ عنایت شہید کا یہ تجربہ کامیاب ہوا جس کی وجہ سے ٹھٹھہ میں ان کے مرید کسان ریاستی محصولات سے آزاد ہوئے اور زندگی خوشحالی کی طرف گامزن ہوئی۔ صوفی شاہ عنایت کے تجربے کی کامیابی کا چرچہ ہونے لگا اور علاقے کے دوسرے کسان بھی آپ کے حلقہ میں آنے لگے جس کی وجہ سے آپ کے مرید دن بہ دن بڑھتے گئے اور اکثر جگہوں پر

اجتماعی زراعت کا مطالبہ کیا جانے لگا جو کہ جاگیردار اور زمیندار طبقہ کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر ٹھٹھہ کے جاگیردار اور ریاستی صوبیدار صوفی شاہ عنایت کے خلاف ہو گئے کیونکہ شاہ عنایت کے اس نظریہ کی وجہ سے کسانوں پر ان کا کنٹرول کم ہوتا جا رہا تھا۔ کسان زمینداروں کے استحصالی شکنجے سے آزاد ہو رہے تھے اور جاگیردارانہ نظام ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھٹھہ کے زمینداروں اور ریاستی صوبیداروں نے شاہ عنایت کے خلاف سازشیں شروع کیں۔ مرکز میں مغل حکمراں فرخ کے کان بھرے اور کہا کہ شاہ عنایت دعویٰ سلطنت کر رہے ہیں اور خلیفۃ اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔

صوفی شاہ عنایت امن پسند بزرگ تھے۔ آپ کو جب جھوک کے زمینداروں اور صوبیداروں کی مخالفت کا پتہ چلا تو انہیں دکھ ہوا۔ مگر آپ نے کسانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور یہ جدوجہد بڑھتے بڑھتے جنگ کی صورتحال تک پہنچ گئی۔ یہ جنگ چار مہینے تک جاری رہی اور جب ریاست کی پیشہ ور فوج شکست کے کنارے پہنچ چکی تھی اور فتح پانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا تو دشمن نے دغا و فریب سے کام لیا اور صلح کی تجویز پیش کی اور صلح کے بہانے صوفی شاہ عنایت کو گرفتار کیا گیا اور قید کرنے کے بعد شہید کر دیا گیا۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ صوفی شاہ عنایت شہید کی تحریک کی ناکامی کی وجہ اس وقت کے سماجی حالات تھے۔ میرے ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ کیا تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے وقت اور حالات کا انتظار کرنا پڑتا ہے یا انقلاب کے لیے وقت اور حالات کو دیکھا جاتا ہے؟ یا معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور برائیوں کے خلاف بغیر کسی انتظار کے منظم ہو کر کھڑا ہونے کو انقلاب کہا جاتا ہے؟

آج بھی صوفی شاہ عنایت شہید کے مزار پر ہر سال عرس لگتا ہے جہاں صوفی فنکار آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں جسے سننے کے لیے پوری سندھ سے صوفی شاہ عنایت شہید کے عقیدت مند آتے ہیں اور عرس میں شریک ہو کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ شاہ عنایت شہید کے نظریات اور فکر پر کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی تحریک کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ کا نعرہ ''جو کھیرے سو کھائے'' مطلب ''جو بوئے وہ کھائے'' سندھ میں ایک انقلابی نعرے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ آج بھی ہمیں ایسی جدوجہد کی ضرورت ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا کہ استحصال آج بھی ہو رہا ہے اگرچہ اس کی شکل بدل چکی ہے اور استحصالی قوتیں زیادہ منظم اور طاقتور ہو کر کسانوں کا استحصال کر رہی ہیں کیونکہ ان کا مقصد صرف اپنے طبقے کا مفاد ہے جو سرمایہ دار، جاگیردار اور دیگر قوتوں کے اتحاد کی شکل میں نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ سبط حسن، نوید فکر، مکتبہ دانیال، کراچی: 1982، صفحہ 180۔
2۔ مبارک علی، سندھ خاموشی کی آواز، فکشن ہاؤس، لاہور: 1994، صفحہ 144۔
3۔ سبط حسن، بحوالہ بالا، صفحہ 192-191۔
4۔ سبط حسن، بحوالہ بالا، صفحہ 205-204۔

تحفظ خوراک بمقابلہ خوراک کی خودمختاری

تحفظ خوراک: تحفظ خوراک کا نظریہ سرمایہ دار حکومتیں اور ان کی بین الاقوامی کمپنیوں کا پیش کردہ ہے۔ یہ نظریہ خوراک کے بنیادی حق کو تسلیم کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نقاط پر مبنی ہے:

- عوام کی خوراک تک مستقل اور مسلسل رسائی۔
- براہ راست غذائی فراہمی یا بالواسطہ نقد رقم کی صورت میں۔
- ضرورت کے مطابق معیاری غذا کی فراہمی۔
- صارفین کو ثقافتی حوالے سے ہم آہنگ غذا کی فراہمی۔

تحفظ خوراک کا نظریہ صرف ضرورت کے مطابق غذائی تحفظ اور اس کی عوام تک رسائی پر یقین رکھتا ہے یہ جانے بغیر کے غذا کہاں سے آئے گی، کس طریقے سے اور کس پیمانے پر اگائی جائے گی۔ یہ نظریہ معاشرہ میں طبقاتی، معاشرتی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تحفظ کو مدنظر نہیں رکھتا۔ تحفظ خوراک کا نعرہ بظاہر انتہائی پراثر دیکھائی دیتا ہے لیکن عوام کو حقیقی خود کفالت سے دور رکھتا ہے۔ اگر اس کا بغور تجزیہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ اس نظریہ کے تحت خوراک کی خود کفالت ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ منڈی پر مبنی نجی کمپنیوں اور اداروں کے ذریعہ درآمد کو فروغ دیتے ہوئے تحفظ خوراک کو یقینی بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریے کے تحت دنیا سے بھوک کا خاتمہ ناممکن ہے۔

خوراک کی خودمختاری: عوام دوست اور کسان دوست گروہ خوراک کی خودمختاری کے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ اس نظریے کے بنیادی نقاط درج ذیل ہیں:

- زرعی پالیسی سازی اور اس کے اطلاق کے حوالے سے عوام کی شمولیت، مشورہ، رائے، مشورہ اور فیصلہ سازی۔
- خوراک کے دیگر پیداواری ذرائع پر عوام کا مکمل اختیار۔
- ماحولیاتی تحفظ کے تحت قدرتی طریقہ زراعت کی بنیاد پر غذائی اور زرعی پیداوار۔
- درآمدی غذا پر پابندی اور مقامی منڈی کا فروغ۔
- ثقافتی حوالے سے ہم آہنگ غذا کی پیداوار۔
- سامراجی مداخلت کے بغیر زرعی پالیسی سازی اور اطلاق

خوراک کی خودمختاری کا نظریہ غذا کی پیداوار، ترسیل اور صرف/استعمال (consumption) کے دائرے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس نظریے کا بنیادی نقطہ غذا پیدا کرنے والی آبادیوں کا اپنے روزگار اور طرز زندگی پر مکمل اختیار ہے۔ یقیناً خوراک کی خودمختاری پیداواری وسائل مثلاً زمین، بیج، پانی اور جنگلات وغیرہ پر مکمل اختیار اور رسائی کو یقینی بناتا ہے۔ یہ غذائی پیداوار کے طریقہ کار کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہوئے کیمیائی اشیاء سے پاک قدرتی پیداواری طریقوں بشمول ماحولیاتی تحفظ کو لازم مانتا ہے۔ خوراک کی خودمختاری دراصل تحفظ خوراک کے برعکس خوراک کی خود کفالت کے لیے عوامی جدوجہد اور سیاسی منصوبہ بندی کو بنیاد بناتے ہوئے لوگوں کے حقوق اور منڈی کے درمیان تضاد کو واضح کرتے ہوئے عوام کو منڈی پر فوقیت دیتا ہے۔

میڈیا ریلیز: بی ٹی مکئی پر فلپائن سے ایک تحقیقی رپورٹ ☆

ترجمہ: اظفر رضا

اس خبر کی بنیاد پر کے کسان بی ٹی مکئی کی کاشت کو ترجیح دے رہے ہیں فلپائن کے محکمہ زراعت کو اس متنازعہ فصل کی کاشت فروغ نہیں دینا چاہیے۔ ایک حالیہ مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ ملک میں چھوٹے کاشتکار جو جی ایم مکئی کی کاشت کر رہے ہیں وہ بالآخر زیادہ مقروض اور غریب نظر آتے ہیں۔ یہ اس ابتدائی دعوؤں کی نفی ہے کہ جی ایم مکئی کی کاشت سے کسانوں کی آمدنی بڑھ جائے گی۔

فلپائن کے کسان سائنسدان گروپ ماسی پاک (MASIPAG) کے ساتھ مشترکہ تحقیق میں بتایا ہے کہ مکئی کے چھوٹے کاشتکار جن کی تعداد سارے ملک میں تقریباً دو لاکھ ستر ہزار ہے آخر کار دیوالیہ اور تاجروں (جو سرمایہ کار بھی ہوتے ہیں) کے مقروض ہو جاتے ہیں۔ ای بون (IBON) نے مختلف علاقوں کی مقامی حکومتوں کے افسران سے انٹر ویو کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہائبرڈ مکئی کی کاشت کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں کیونکہ اس پر خرچ کم آتا ہے۔ تاہم کاشت کار یہ شکایت کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے جی ایم مکئی نہ لگائی تو تاجر انہیں قرض فراہم نہیں کرتے ہیں۔

اس سے بھی افسوس ناک بات یہ ہے کہ جی ایم مکئی کے بیجوں کی قیمت اس کی تعارفی قیمت کے مقابلے 282 فیصد بڑھ چکی ہے۔ راؤنڈ اپ (Roundup) ہربیسائیڈ پہلے جی ایم مکئی کے بیج کے ساتھ ملتی تھیں اب الگ سے فروخت کی جاتی ہے۔ صرف جی ایم مکئی کے بیج سے ہی کسانوں کی کل پیداواری لاگت میں 21-18 فیصد اضافہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف کھاد سے 23 فیصد اضافہ ہو جاتا ہے۔

کسانوں نے اپنے انٹرویو میں تاجروں اور سرمایہ کاروں کی طرف سے قرضوں پر اونچے اونچے سود کی بھی شکایت کی۔ سود کی ادائیگی سے چھوٹے کسانوں کی پیداواری لاگت 26 فیصد تک بڑھ جاتی ہے جس میں ابتدائی اشیاء کی خریداری پر مارک اپ بھی شامل ہے۔ مزید برآں ای بون (IBON) نے اپنے مطالعے میں ماحول اور صحت پر برے اثرات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر کاشتکاروں نے بتایا کہ اگر چہ پہلی فصل سے اچھی پیداوار ہو جاتی ہے تاہم بعد میں کھاد اور زرعی ادویات کی ضرورت بڑھ جاتی ہے کیونکہ وبائی بیماریوں کی شرح میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جراثیم کش برداشت کرنے والی بی ٹی مکئی کو زیادہ سے زیادہ گلائیفو سائیٹ (glyphosate) کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے جو راؤنڈ اپ ہربیسائیڈ کا بہت ہی فعال حصہ ہے جسے زرعی کیمیائی کارپوریشن مونسانٹو نے متعارف کرایا ہے۔ اسی نے پہلے بی ٹی مکئی اور بعد میں راؤنڈ اپ ریڈی جی ایم مکئی کو ملک میں متعارف کرایا تھا۔

صحت کے مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔ مطالعے سے معلوم ہوا کہ کاشت کار مبینہ طور پر جب زیادہ لمبے عرصے تک بی ٹی مکئی کے درمیان رہیں تو پیٹ کے درد، دست، سینے کے درد، خارش اور جلدی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسان اور ان کے اہل خانہ بھی مبینہ طور پر چھوٹے جی ایم بھٹے کھانے سے ہونٹوں اور زبان کی بے حسی کا شکار ہوئے۔ جی ایم مکئی پر میدانی تحقیقات ان علاقوں میں ہوئی Hoilo' Capiz' Isabela' Pantgasinan' Bukidon' South Cotabato' اور Sultan Kudarat۔ ہر چند وہاں معیاری قوانین وضوابط موجود ہیں پھر بھی وہاں کی جی ایم فصلوں کی نگراں ایجنسی بیورو آف پلانٹ انڈسٹری (BPI) نے تا حال جی ایم مکئی کے تجارتی پیمانے پر پھیلاؤ کا ماحول اور اس مکئی کے کاشتکاروں اور ان کے خاندان کی صحت پر اثرات کی نگرانی اور بعد نگرانی کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اسی طرح مال مویشی پر بھی اثرات کا کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔ حالانکہ وہ جی ایم مکئی کو بطور غذا براہ راست استعمال کرتے ہیں۔

ای بون نے فلپائن کی ایکونو (AQUINO) حکومت کو ہدایت کی ہے کہ وہ فلپائن کے کھیتوں کے لیے اضافی جی ایم فصلوں کی بحالی سے پہلے قواعد وضوابط کی سختی سے پابندی کرے۔ اس میں جی ایم مکئی کے اثرات کا مکمل جائزہ لیا جانا لازمی ہے۔ اسے کسانوں کی طرز زندگی، آمدنی اور ان کی مکمل علاج و بہبود پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

مندرجہ بالا تحقیق کے بعد ای بون فاؤنڈیشن (IBON FOUNDATION) نے محکمہ زراعت کو ہدایت کی کہ وہ متنازعہ فصل کو فروغ دینے سے روکیں اور اگر فلپائن کے کھیتوں میں مزید جی ایم فصلیں اگائی جاتی ہیں تو سختی کے ساتھ ضابطوں کا خیال رکھا جائے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ جی ایم فصلوں کے اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے۔ تحقیقاتی گروپ نے یہ بھی کہا کہ محکمہ کو کاشتکاروں پر حقیقی اثرات' ان کے روزگار، آمدنی اور فلاح و بہبود پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

☆ تحقیقی رپورٹ کو اگلے شمارے میں تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

زمینی اصلاحات پر قومی اور صوبائی مشاورت

رپورٹ: پاکستان کسان مزدور تحریک/ روٹس فار ایکوٹی

پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی کے باہمی تعاون سے پاکستان میں زمینی اصلاحات کے موضوع پر ملک کے مختلف طبقوں خصوصاً کسانوں سے مشاورت کے ایک سلسلے کا آغاز کیا گیا۔ اس سلسلے کی پہلی مشاورت 28 اپریل کو کراچی میں، دوسری 15 مئی کو لاہور میں اور تیسری 17 مئی، 2012 کو پشاور میں منعقد ہوئی۔ صوبہ بلوچستان میں امن وامان کی صورتحال کے باعث مشاورتی اجلاس نہ ہوسکا تاہم کوشش کی گئی کہ اس صوبے کی نمائندگی قومی مشاورت کے اجلاس میں ہوسکے۔ قومی مشاورتی اجلاس 21 مئی کو اسلام آباد میں منعقد ہوا۔

زمینی اصلاحات پر مشاورت کا مقصد آئندہ ہونے والے انتخابات ہیں۔ کیونکہ 2013 میں تمام سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور کے ساتھ عوام سے ووٹ لینے میدان میں اتریں گیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس موقع پر زرعی اصلاحات کے حوالے سے کسانوں، ہاریوں اور دیگر طبقات کے ساتھ مشاورت کر کے مشترکہ تجاویز سامنے لائی جائیں اور انہیں سیاسی جماعتوں تک پہنچایا جائے تاکہ نہ صرف سیاسی جماعتیں زراعت سے متعلق تجاویز کو اپنے منشور میں جگہ دیں بلکہ اس ضمن میں قانون سازی یقینی بنائیں۔ ایک اور اہم مقصد عوام، خاص کر کے دیہی عوام جب نئی حکومت کے لیے اپنے نمائندے منتخب کریں تو اس بات کو مدنظر رکھیں کہ وہ جس سیاسی جماعت یا نمائندے کو ووٹ دے رہے ہیں وہ کس حد تک ان کے مسائل کی سمجھ رکھتے ہیں اور انہیں حل کرنے کے لیے کس حد تک سنجیدہ ہیں۔ پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی کا اس بات پر یقین ہے کہ بے زمین کسانوں اور ہاریوں کے خلاف استحصالی قوتوں کا مقابلہ معاشرہ کے دیگر طبقات کے تعاون کے ساتھ ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاورت میں دیگر شعبوں سے شرکاء کو شامل کیا گیا۔

قومی مشاورت برائے زمینی اصلاحات کے موقع پر ''زرعی اصلاحات اور نیولبرل زراعت: تاریخی پس منظر اور موجودہ صورتحال'' کے موضوع پر ڈاکٹر عذرا طلعت سعید نے اپنے کلیدی خطاب میں زرعی پالیسیوں کے تاریخی پس منظر کو بیان کیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی تاریخ میں ہونے والے دیگر زمینی اصلاحات اور کارپوریٹ فارمنگ کے تحت زمین پر قبضے کی معلومات فراہم کیں۔ زمینی اصلاحات پر تحقیق یہ بتاتی ہے کہ 3 فیصد سے زائد چھوٹے کسانوں کو پچھلی زمینی اصلاحات کا فائدہ نہیں ہوا۔ کسی بھی زمینی اصلاحات میں اس بنیاد پر قانون سازی نہیں کی گئی کہ سب کے پاس برابر کی زمین ہو بلکہ زور اس پر تھا کہ زمین کی ملکیت کی حد زیادہ سے زیادہ کتنی ہونی چاہیے۔ سوشل پالیسی اینڈ ڈیولپمنٹ سینٹر کے 1990 کی دہائی کے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کی کل زرعی زمین کے 50 فیصد پر 4 فیصد دیہی گھرانے قابض ہیں اور بقیہ 50 فیصد زمین 96 فیصد دیہی گھرانوں کی ملکیت ہے۔ یہ اعداد وشمار واضح کرتے ہیں کہ پاکستان میں آج بھی جاگیردار خاندان بہت مضبوط ہیں۔

قومی اور صوبائی سطح پر مشاورت میں مندرجہ ذیل چار سوالات کے اردگرد تبادلہ خیال ہوا:

1۔ کیا زمینی اصلاحات مسئلہ ہیں یا نہیں؟
2۔ لینڈ گریبنگ (زمین پر قبضہ) کا مسئلہ ہے کہ نہیں؟
3۔ خوراک کی خودمختاری اور زرعی معیشت کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟
4۔ عوام اور کسان گروہوں کا حقیقی اصلاحات کو نافذ کروانے، لینڈ گریبنگ سے نمٹنے اور خوراک کی خودمختاری کو آگے بڑھانے میں کیا کردار ہوسکتا ہے؟

1۔ قومی مشاورت میں پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا کہ زمین کی مساویانہ تقسیم اب ہماری تحریک کا بنیادی نسب العین ہے۔ اس موقف کو لاہور کی صوبائی مشاورت میں ڈاکٹر مبارک علی نے اجاگر کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ زرعی اصلاحات کی اصطلاح سے وہ متفق نہیں ہیں کیونکہ اصلاحاتی رویہ کی وجہ سے پرانا نظام تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ ویسے ہی چلتا رہتا ہے اور یہ عمل موجودہ نظام کو زیادہ مستحکم کرتا ہے۔ مشاورت میں شریک کسی بھی فرد نے زمین کی مساویانہ تقسیم کی مخالفت نہیں کی۔

قومی اور صوبائی مشاورت میں جاگیرداری کے خلاف بھرپور موقف سامنے آیا۔ کہا گیا کہ جس سماج میں جاگیرداری ہوتی ہے وہاں جمہوریت نہیں ہوتی۔ ہندوستان نے جاگیرداری کے خاتمہ کا اعلان کر کے ثابت کیا کہ اس کی روح میں جمہوریت ہے جبکہ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو پایا۔ یہاں جاگیردار، فوج اور بیوروکریسی تین ستون ہیں، ان کا ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ ہے۔ جاگیرداروں کا دفاعی طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی حکمراں جماعت میں شامل ہوجاتے ہیں۔ جاگیرداروں نے جمہوریت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ جاگیرداری ایک ذہنی رویہ بھی ہے جس سے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے طبقاتی نظام بڑھتا ہے۔ سندھ کی مشاورت میں پاکستان کی ابھرتی ہوئی پارٹی پاکستان تحریک انصاف کے نمائندے نے یہ بات اٹھائی کہ پاکستان میں جاگیرداری نہیں ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ صرف سندھ میں ہی مہر، جتوئی، شیرازی خاندان چند بڑے نام ہیں اسی طرح لغاری خاندان کے پاس وسیع جاگیر ہے۔ ان خاندانوں کے زیر ملکیت زمین کا رقبہ ہزاروں ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ میں سوات کے علاقے میں بڑی بڑی جاگیریں ہیں لیکن اس صوبے میں جاگیرداری کا وہ ڈھانچہ نہیں جو سندھ اور جنوبی پنجاب میں موجود ہے۔ کسانوں نے اپنے گاؤں اور علاقے میں جاگیرداروں کے استحصالی عمل کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ زمین کی تقسیم کے ساتھ جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ غربت کی وجہ سے کسان خودکشیاں کر رہے ہیں۔ جب تک جاگیرداری ختم نہیں ہوگی اس وقت تک کسانوں کے مسائل ختم نہیں ہوں گے۔

مشاورت میں کہا گیا کہ زرعی اصلاحات کا نعرہ اس صورت میں لگایا جائے جس سے جاگیرداری کا خاتمہ ہو۔ ماضی میں کی جانے والی اصلاحات کا کوئی فائدہ کسانوں کو نہیں

پہنچا بلکہ جاگیرداری کو ہوا۔ بہت سی زمینوں پر چند لوگوں کا قبضہ ہے اور وہ بھی غیر قانونی ہے۔ اصلاحات کے حوالے سے ایک فریم ورک پر زور دیا گیا کیونکہ زمین کی ملکیت کے ساتھ کئی چیزیں جڑی ہوئی ہوتی ہیں جن تک رسائی ضروری ہے جیسے کہ پانی کی فراہمی۔ کچھ شرکاء کی طرف سے زمینی اصلاحات کے لیے تجویز آئی کہ 50 ایکڑ نہری زمین اور 150 ایکڑ بارانی زمین فی خاندان مختص ہونی چاہیے۔ کچے کی زمین کی دوبارہ تقسیم پر بھی زور دیا گیا۔ بلوچستان میں بلوچ بیلٹ میں سرداروں کے پاس جو زمینیں ہیں وہ بھی تقسیم ہونی چاہیے۔ صوبہ خیبر پختون خواہ سے یہ بھی کہا گیا کہ ہمیں زمین کی تقسیم کے حوالے سے مثالی (Ideal) صورت کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ابتدا میں صوبائی سطح پر زمین لے کر سلسلہ وار کسانوں میں تقسیم کرنی چاہیے۔

سندھ میں زمین بانٹنے کی حالیہ حکومتی پالیسی کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا گیا کہ عورتوں کو جو زمین دی گئی تھی اس میں قبرستان کی زمین بھی شامل تھی یا پھر جو زمین دی گئی وہاں پانی نہیں تھا۔ پنجاب کی مشاورت میں زرعی زمین چھیننے کی بات ہوئی۔ جبکہ خیبر پختون خواہ سے یہ موقف سامنے آیا کہ ہمیں شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے لیکن تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برخلاف مشاورت میں یہ بات سامنے آئی کہ اگر ہم ٹیفینسی ایکٹ کو مانتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جاگیرداری کو مان رہے ہیں۔

زمینی اصلاحات کی مشاورت میں کچھ دیگر مسائل بھی زیر بحث آئے جن میں کسان عورت کے حقوق کی بات سب سے اہم تھی۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ عورتوں کو بھی کسان مزدور کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ وہ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ جو زمین بانٹی جائے اسے عورتوں کے نام بھی ہونا چاہیے۔ کسانوں کی سیاسی جماعتوں میں نمائندگی ہونی چاہیے۔ ان میں کسان عورتیں بھی شامل ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کے نام زمین دینے پر بھی زور دیا گیا۔

نہری پانی کی تقسیم کے مسئلے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ انڈس ڈیلٹا کی 23 لاکھ ایکڑ زمین بنجر ہو چکی ہے۔ پانی کے بٹوارے میں بڑے بڑے زمیندار اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں اور چھوٹے کسانوں کو نقصان کا سامنا ہوتا ہے۔

2۔ مشاورت میں زمین غیر ملکیوں کو دینے کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ کہا گیا کہ جب زمین ہی ہمارے پاس نہیں ہوگی تو زمینی اصلاحات کہاں سے ہوں گیں۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ لاکھوں ایکڑ زمین فوجیوں کو دی گئی ہیں اس کو منسوخ کرنا چاہیے۔ جنگلات کی زمین، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان کے قبضے کی زمین اور لینڈ مافیہ کی ہتھیائی ہوئی زمین کی واپسی بھی ہونی چاہیے۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ 20-25 کسانوں کا گروپ بنایا جائے اور جو زمین غیر ملکیوں کو دی جا رہی ہے وہ انہیں دی جائے۔

کراچی کی مشاورت میں نیولبرل پالیسی اور کارپوریٹ فارمنگ پر بات ہوئی۔ یہ کہا گیا کہ پاکستان بہت تیزی سے آزاد معیشت کی پالیسی اختیار کر رہا ہے جبکہ دیگر ممالک اپنے عوام کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اقدامات اٹھا رہے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو ممالک آزاد معیشت اپناتے ہیں وہ قرضہ بہت لیتے ہیں اور اس کو واپس کرنے کے لیے ان کی پوری توجہ آمدنی کے ذرائع بڑھانے پر ہوتی ہے خواہ وہ زمین بیچ کر ہی کیوں نہ ہو مثلاً بینک یا سرکاری املاک بیچ کر۔ ان کا زور غیر ملکی زرمبادلہ اکٹھا کرنے اور قرضوں کی قسط ادا کرنے پر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے عوام کی ضروریات کی جانب توجہ دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جن ممالک نے بھی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے لیے ان کی پوری توجہ عوامی مسائل کی بجائے بجٹ کے خسارے کو کم کرنے پر رہتی ہے جس کی وجہ ہے کہ ان ممالک کے عوام غربت کا شکار ہوتے ہیں۔ کارپوریٹ فارمنگ کے حوالے سے علمی اور تحقیقی سرگرمیوں پر زور دیا گیا۔

3۔ مشاورتی عمل میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہمیں خوراک کے تحفظ کے بجائے خوراک کی خودمختاری کی بات کرنی چاہیے اور یہ بات واضح کی گئی کہ جہاں کارپوریٹ فارمنگ ہوگی وہاں خوراک کی خودمختاری ناممکن ہے۔ وہ ملک یا سرمایہ کار کمپنیاں جو زمین لیز پر لیں گے ان کی مرضی ہوگی کہ وہ جہاں چاہے خوراک لے جائیں۔ چونکہ زمینی اصلاحات، خوراک کی خودمختاری اور زمین پر قبضہ، یہ ساری چیزیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ کسانوں کی اپنی زمین ہو، بیج ہو، جہاں وہ اپنی مرضی کا اناج اگائیں۔ اس وقت آبادگار جو بیج بو رہا ہے، کھاد ڈال رہا ہے اور زمین پر محنت کر رہا ہے وہ اس کو مہنگی پڑتی ہے۔ کسان چاول، گندم وغیرہ مہنگا خریدتا ہے۔ دیگر اخراجات کے لیے زمیندار یا دکاندار سے قرضہ لیتا ہے اور جب فصل تیار ہوتی ہے تو زمیندار اس وقت اپنا قرضہ وصول کر لیتا ہے اور اسے کچھ مہینوں کا وقفہ بھی نہیں دیتا۔ کسانوں کی حالت اتنی بری ہے کہ پورے دن محنت کے بعد ایک وقت کا کھانا ہی مل پاتا ہے۔ ہمارے کسان اب ملٹی نیشنل کمپنیوں کے غلام بن چکے ہیں۔ مائیکرو فنانس کا 40 فیصد سود دے رہے ہیں۔ خوشحالی بینک کا ہر چھوٹا کسان 50-60 ہزار کا مقروض ہے۔ اب اس کا پورا خاندان صرف قرضہ اتارنے میں لگا ہوا ہے۔ مشاورت میں یہ تجویز دی گئی کہ مقامی چھوٹے کسان اپنی پیداوار کی حفاظت کریں۔ کوآپریٹو کا ایک رول ماڈل بنالیں اور اس کے ذریعہ کاشت کریں۔

4۔ کسانوں کو چاہیے کہ وہ ان سیاسی جماعتوں کو ووٹ نہ دیں جنہیں اپنی سیاست چلانے کے لیے جاگیرداری کی ضرورت ہے۔ کسان ان لوگوں کو منتخب کریں جو ان کے لیے کام کریں۔ قومی مشاورت میں کسانوں کو منظم کر کے متحرک کرنے کے لائحہ عمل پر بھی زور دیا گیا۔ ہر ضلع میں تحقیقی مطالعہ پر بھی زور دیا گیا۔ زمینی اصلاحات کے حوالے سے تمام فورم پر بلوچستان کی نمائندگی یقینی بنانے اور نچلی سطح سے تمام دوسرے سماجی گروہوں کو شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ تحریک کو منظم کرنے کے لیے اپنے علاقے میں گروپس بنانے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا پریشر گروپ بنایا جائے جس میں زراعت اور کسان کے مسئلہ سے وابستگی رکھنے والے جمع ہوں۔ ٹریڈ یونین والے اس میں اپنا حصہ ڈالیں گے۔ ایک چینل بنا کر مسائل کو عوام کی سطح پر پہنچائیں۔ مزدور یونین، میڈیا اور دیگر کسان دوست گروہوں کو ساتھ ملا کر ایک مزاحمتی تحریک کے آغاز پر بھی زور دیا گیا جس کے بغیر حقیقی اور پائیدار حل ناممکن ہے۔ پی کے ایم ٹی سو فیصد اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ منظم سوچ اور سیاسی عمل کے ذریعے ہی اس عمل کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

سفارشات

جاگیرداری اور زمینی اصلاحات:

- زمین پر کسان کے حق ملکیت کو تسلیم کر کے جاگیرداری نظام کا مکمل خاتمہ ہونا چاہیے۔
- بے زمین کسانوں بشمول عورتیں کے زمین کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم ہونی چاہیے۔
- زمینی اصلاحات کے لیے ایک فریم ورک تشکیل کیا جائے جس میں کسانوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔
- زمین کے حدود بھی متعین کی جائیں۔ سندھ میں کچے کی زمین کی دوبارہ تقسیم کی جائے۔

دیگر سفارشات

- جبری مشقت (Bonded labour) کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

زمین پر قبضہ اور کارپوریٹ فارمنگ

- زمین پر مقامی لوگوں کا حق تسلیم کیا جائے۔ کارپوریٹ فارمنگ کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ استعماریت کی ایک نئی شکل ہے۔
- جنگلات کو قبضہ گیروں سے چھڑا کر ان پر غریب کسانوں اور چھوٹے آبادکاروں کا حق تسلیم کیا جائے اور وہاں دوبارہ جنگلات اگانے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

خوراک کی خودمختاری اور زرعی مارکیٹ معیشت

- خوراک کے تحفظ کے بجائے خوراک کی خودمختاری کی اصطلاح استعمال کی جائے
- ناقص بیج اور کمپنیوں کے بیج کو ختم کرنا چاہیے جن کی وجہ سے کسانوں کی بدحالی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مائیکرو فائنانس، کیڑے مار ادویات، کیمیکل کھاد پر انحصار ختم کیا جائے۔ کیڑے مار ادویات سے متعلق شعور بیدار کرنا چاہیے۔
- کسان مل کر کوپریٹو (Co-operative) زراعت کا رول ماڈل بنائیں اور اس کے ذریعہ کاشت کریں۔
- حکومت پاکستان فصل خرید کر کسان کو پہلے ہی پیسہ دے دے اور ان کی صحت اور تعلیم کی ذمہ داری لے۔
- غذائی اجناس درآمد کرنے کے بجائے حکومت مقامی اجناس کی خریداری میں تعاون کرے۔
- زرعی پالیسی بنانے میں یقیناً چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی فیصلہ سازی کے مراحل میں شرکت ہونی چاہیے۔
- کسانوں کو چھوٹے قرضے دیے جائیں جن پر سود نہ ہو۔ غربت کے خاتمہ کے خلاف اقدامات کیے جائیں۔

ذیلی مسئلے

کسان عورت

- زمین پر کاشت کرنے والی عورت کا برابر کا حق تسلیم کیا جائے۔
- کسان عورتوں کو زمین کا حق ملکیت حاصل ہونا چاہیے۔

نہری پانی کی تقسیم

- پانی کی تقسیم کے نظام کو بہتر کرتے ہوئے پانی کی منصفانہ تقسیم ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں صوبوں کی شکایات دور کی جائیں۔
- بڑے ڈیم بنانے کی مخالفت کی گئی۔

دیگر مسائل

- طبقاتی اور مذہبی تفریق کو ختم کیا جائے۔ مذہبی اقلیت کا استحصال نہ ہو۔ انہیں بھی زمینیں دی جائیں۔

لائحہ عمل

- زمینی اصلاحات کروانے کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت پر زور دیا گیا۔
- لوگوں کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ کسان ایک پریشر گروپ بنائیں اور نچلی سطح سے کام شروع کریں۔
- اصلاحاتی رویہ درست نہیں، سرمایہ داری نظام کو سرے سے ختم کرنا چاہیے۔
- ہر ضلعے میں بحث ومباحثوں کا آغاز ہونا چاہیے تاکہ وہ نمائندے سامنے آئیں جو زمینی حقائق سے جڑے ہوئے ہوں۔
- کسانوں کی اپنے حقوق کے حوالے سے شعور ہونا چاہیے تاکہ کسان خود اپنی جدوجہد کے ذریعے آگے بڑھ سکیں۔
- مختلف کسان مزدور تنظیموں کا ایک مشترکہ ایجنڈا ہو۔ جلسہ جلوس کریں، لانگ مارچ کے لیے نکلیں۔ میڈیا کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔
- مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاسی جماعتوں میں کسانوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔
- زراعت سے متعلق امور کو سیاسی جماعتوں کے منشور میں شامل کرائیں۔
- کسان ان لوگوں کو منتخب کریں جو ان کے مقاصد کے لیے صحیح طور سے کام کریں۔
- تبدیلی کے لیے عام آدمی کو اسمبلی تک پہنچنا ہے۔
- بلوچستان سے نمائندگی کو یقینی بنایا جائے۔

بات تو سچ ہے مگر... زرعی خبروں کا جائزہ (اپریل تا جون 2012)

الف۔ ملکی زرعی خبریں

ا۔ زرعی مواد

زمین

16 اپریل: اسٹیٹ بینک کی غذائی تحفظ پر رپورٹ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ملک میں غذائی تحفظ کے لیے زرعی زمین کی منصفانہ تقسیم اور کسانوں کو پاکستان کے دستور کے مطابق حقوق فراہم کرنا بہت ضروری ہے (دی نیوز، 17 اپریل، صفحہ 15)۔

16 اپریل: سندھ حکومت کے فیصلے کے مطابق ہوا سے توانائی پیدا کرنے کے لیے 26,000 ایکڑ زمین سندھ کے ہوا کے خطے (wind corridor) میں مختص کی جا چکی ہے۔ ٹھٹھہ اور جھمپیر میں یہ زمین 12 سرمایہ کاروں کو دی گئی ہے جس میں ایک غیر ملکی کمپنی شامل ہے (دی نیوز، 17 اپریل، صفحہ 20)۔

15 مئی: سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ کو بتایا گیا کہ اب تک موجودہ حکومت نے 56,187 ایکڑ زمین کسانوں میں تقسیم کی ہے جبکہ 53,208 ایکڑ زمین کچے کے علاقے میں اور 6,500 ایکڑ پکے کے علاقے میں دستیاب ہے۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ لینڈ گرانٹ پالیسی کے تحت مزید حکومتی زمین تقسیم کی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک حکومت سندھ نے کسانوں کو چار ایکڑ زمین کے ساتھ بیج، فرٹیلائزر اور پانی بھی فراہم کیا (دی نیوز، 16 مئی، صفحہ 19)۔

21 مئی: پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی کے تعاون سے اسلام آباد میں زمینی اصلاحات پر مشاورت میں شرکاء نے زمین کی مساویانہ تقسیم اور غذائی تحفظ کے لیے خوراک کی خودمختاری کا مطالبہ کیا (ایکسپریس ٹریبیون، 22 مئی، صفحہ 4)۔

29 مئی: ملک میں نجی زرعی زمین کے سینسس کے اعداد و شمار کے مطابق 0.25 فیصد امیر زمینداروں کے پاس ملک کے 67 فیصد غریب کسانوں کی کل زمین کے برابر زمین ہے۔ بے زمین کسانوں کی تعداد سینسس میں شامل نہیں (ڈان، 30 مئی، صفحہ 2)۔

4 جون: حیدرآباد سے جاری سول سوسائٹی کے اعلانیہ کے مطابق ذوالفقار آباد کا منصوبہ سندھ کی ساحلی پٹی غیر ملکیوں کو دینے کی سازش ہے جس کے اثرات ون یونٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے کیونکہ اس کے ذریعے ترقی کے نام پر جنوبی سندھ سندھیوں سے خالی کرا لیا جائے گا (ڈان، 5 جون، صفحہ 18)۔

جبری مشقت:

جون: قومی اور پنجاب حکومت کے بجٹ میں جبری مشقت کو ختم کرنے کے کام پر بہت کم رقم مختص کرنے پر جبری مشقت کے خلاف قومی اتحاد نے تشویش کا اظہار کیا (ڈان 12 جون، صفحہ 2)۔

16 جون: نواب شاہ میں قاضی احمد کے قریب ایک فارم سے، عدالت کے فیصلہ کے مطابق پولیس نے 16 جبری مشقت کے مزدوروں کو آزاد کرایا (ڈان، 17 جون، صفحہ 20)۔

بیج

11 مئی: ایک رپورٹ کے مطابق فصلوں کی نئی اقسام کی اجازت دینے والا ادارہ نیشنل بائیو سیفٹی سینٹر ایک ترقیاتی پروجیکٹ کی طرح چل رہا تھا۔ اس کی مدت اگست 2011 کو ختم ہو جانے سے اب اس ادارے کا کوئی وجود نہیں۔ اس ادارے کا اہم کام جینیاتی بیجوں کی کمرشیل لائزیشن تھا (ایکسپریس ٹریبیون، 12 مئی، صفحہ 10)۔

10 جون: اخباری نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے زرعی یونیورسٹی ٹنڈو جام کے پروفیسر محمد اسمائیل قمبر نے کہا کہ ہائبرڈ اور جینیاتی چاول کی اقسام زیادہ پیداوار تو دیتی ہیں لیکن یہ ذائقہ دار نہیں ہوتیں اس لیے کم قیمت پر بکتی ہیں۔ اس کے علاوہ نمی زیادہ ہونے کی وجہ سے چاول جلدی ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب چاول کے علاوہ گندم، کپاس اور ٹماٹر کی ایسی اقسام متعارف ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے مقامی بیج کی اقسام ختم ہو رہی ہیں، اب کسان جلد ان کمپنیوں کے قبضے میں چلے جائیں گے جن کے پاس ان بیجوں کے پیٹنٹ یعنی ذہنی ملکیت کے حقوق ہیں۔ ان بیجوں میں پائی جانے والی بیماری مقامی پودوں کی اقسام کے لیے خطرے کا باعث بھی ہوتی ہے۔ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے نمائندے نے اس انٹرویو کے دوران کہا کہ ہائبرڈ بیج کو بہت دن تک رکھا نہیں جا سکتا اور نہ دوبارہ بویا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق اس وقت پاکستان میں چاول کی کئی دیسی اقسام موجود نہیں ورنہ انہیں بین الاقوامی مارکیٹ میں دوگنی قیمت پر بیچا جا سکتا تھا (دی نیوز، 10 جون، صفحہ 18)۔

13 جون: ایک اخباری مضمون میں بتایا گیا ہے کہ پلانٹ بریڈرز رائٹرز (PBR) بل مارچ 2012 سے قومی اسمبلی میں زیر غور ہے (سید محمد علی کا مضمون: ایکسپریس ٹریبیون، 13 جون، صفحہ 6)۔

سورج مکھی کا بیج:

12 مئی: میر پور خاص کے کسانوں کی طرف سے سورج مکھی کی ناقص بیج سے فصل کی خرابی کی شکایت کے بعد حیدرآباد سے ریجنل فیڈرل سیڈ سرٹیفیکیشن ڈپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر، ڈپٹی ڈائریکٹر اگریکلچر ایکسٹنشن میر پور خاص اور سنجینٹا کمپنی کے نمائندے نے میر پور خاص سے سورج مکھی کے پھولوں کے نمونے جمع کیے تاکہ صحیح تجزیہ کیا جا سکے (ڈان، 13 اپریل، صفحہ 18)۔

16 مئی: عالمی ادارہ برائے خوراک (FAO) اور اقوام متحدہ کے ساتھ بدین کے سیلاب سے متاثرین کسانوں نے ''سورج مکھی'' کا دن منایا۔ کسانوں کے لیے اس منعقدہ ثقافتی شو میں FAO، آسٹریلین امدادی ادارے (AUSAID) اور برطانوی امدادی ادارے (UKAID) کے مشترکہ تعاون سے 58,500 متاثرہ خاندانوں میں دو کلو سورج مکھی کے بیج کے علاوہ

یوریا اور ڈی اے پی تقسیم کی گئی۔ FAO کا یہ پروگرام سیلاب سے متاثرہ چار اضلاع میں منعقد کیا جائے گا جس میں ٹنڈو الہ یار اور میر پور خاص بھی شامل ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 17 مئی، صفحہ 15)۔

25 جون: پچھلے سال کی بارشوں کے بعد 150,000 ٹن سورج مکھی کے بیج صرف میر پور خاص ڈسٹرکٹ میں کاشتکاروں میں تقسیم کے لیے دیئے گئے لیکن فصل کی خرابی اور بڑے پیمانے پر نقصان کی وجہ کسانوں کے مطابق ناقص بیج تھے۔ سندھ آئل سیڈ کا محکمہ اب بند کر دیا گیا ہے۔ (دی نیوز، 26 جون، صفحہ 2)۔

پانی

17 مئی: ایک اخباری مضمون کے مطابق ہندوستان پاکستان کے تین بڑے دریا سندھ، چناب اور جہلم پر 7 پن بجلی گھر کے منصوبے بنانے کے لیے اقوام متحدہ سے 10 سالوں کے لیے 700 ملین ڈالرز کے کاربن کریڈیٹ خرید رہا ہے، ہر کاربن کریڈیٹ مارکیٹ میں بیچا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہیگ کے شہر میں بین الاقوامی ثالثی عدالت میں کشن گنگا ڈیم کے حوالے سے مقدمہ چل رہا ہے اگر ہندوستان کاربن کریڈیٹس خریدنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر ہندوستان بین الاقوامی ثالثی عدالت میں کشن گنگا ڈیم منصوبوں میں بھی مضبوط پوزیشن میں آجائے گا۔ ہندوستان کے پاکستانی دریاؤں پر ڈیم بنانے کی وجہ سے پاکستان کو پانی کے بحران کا سامنا کرنا پڑے گا (خالد مصطفیٰ کا مضمون: 17 مئی، صفحہ 12)۔

پانی کی قلت اور زراعت:

16 اپریل: ایک خبر کے مطابق جنوبی سندھ کے کپاس والے علاقے 50 فیصد پانی کی کمی کا سامنا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے کپاس کا 5 سے 6 لاکھ ایکڑ رقبہ متاثر ہوگا (محمود حسین خان کا مضمون: ڈان، 16 اپریل، صفحہ)۔

21 مئی: سندھ میں کپاس کی کاشت کے رقبے میں پچھلے سال کی نسبت تقریباً 7 فیصد کمی کی وجوہات میں بیج کا کم اگاؤ اور پانی کی کمی شامل ہے (ڈان، اکانومک اینڈ بزنس ریویو، 21 مئی، صفحہ III)۔

11 جون: پنجاب میں کپاس سنگین بحران کا شکار ہے۔ کاشت کے رقبے کا ہدف جو کہ 6.2 ملین ایکڑ مقرر کیا گیا تھا اس میں جون کے پہلے ہفتے تک 20 فیصد کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ ماہرین کے مطابق اس کی بنیادی وجہ بوائی کے دنوں میں پانی کی کمی ہے (ڈان، 11 جون، صفحہ III)۔

14 جون: سندھ کی آبادگار تنظیموں نے صوبائی بجٹ 2012-13 میں آبپاشی کے لیے مختص کی گئی رقم پر تشویش کا اظہار کر دیا ہے (ڈان، 15 جون، صفحہ 18)۔

19 جون: موسم گرما کے دوران راولپنڈی اور اسلام آباد پانی کی کمی کا شکار رہیں گے جبکہ کانپور ڈیم میں پانی کی کمی کی وجہ سے صوبہ پنجاب اور خیبر پختونخواہ کا آبپاشی نظام بھی متاثر ہوگا (ڈان، 20 جون، صفحہ 11)۔

25 جون: ایک اخباری خبر کے مطابق ترقی پزیر ممالک بشمول پاکستان میں زرعی پیداوار کے لیے شہر کا سیوریج استعمال ہو رہا ہے۔ خبر میں کہا گیا کہ چھوٹے کسان اکثر اس پانی کو اہمیت دے رہے ہیں کیونکہ اس میں بے تحاشہ غذائی اجزاء موجود ہیں جس کی وجہ سے کیمیائی کھاد اور ادویات کے اخراجات سے بچا جاسکتا ہے (ڈاکٹر ایم طارق جاوید اور ڈاکٹر سبز علی خان کا مضمون: ڈان، 25 جون، صفحہ III)۔

28 جون: بلوچستان میں انکار کور ڈیم خشک ہونے کی وجہ سے گوادر شہر اور گردونواح کے علاقے پانی کی کمی کا شکار ہیں (دی نیوز، 28 جون، صفحہ 17)۔

29 جون: پلاننگ کمیشن آف پاکستان نے صارفین کو پانی کے آبیانے کی ادائیگی پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس طرح سے پانی اور بجلی کا بحران حل کرنے میں مدد ملے گی (دی نیوز، 30 جون، صفحہ 15)۔

بیرونی امداد اور آبپاشی کے منصوبے:

9 جون: ایشیائی ترقیاتی بینک کے ایک تین رکنی وفد نے دیامیر بھاشا ڈیم کا دورہ کرتے ہوئے کہا کہ بینک ڈیم کی تعمیر کے لیے مزید 5 بلین ڈالر فراہم کرے گا (دی نیوز، 9 جون، صفحہ 2)۔

16 جون: ایک خبر کے مطابق امریکی امدادی ادارہ (USAID) پاکستان کے حکومتی افسران کو باکفایت آبپاشی نظام اور پانی کی کفایت کے حوالے سے پالیسی مرتب کرنے کی تربیت کرے گا (دی نیوز، 16 جون، صفحہ 5)۔

29 جون: ایک خبر کے مطابق تربیلہ ڈیم سے پن بجلی بڑھانے کے لیے 18 مقامی اور بین الاقوامی کمپنیوں نے دلچسپی ظاہر کی ہے (دی نیوز، 29 جون، صفحہ 18)۔

II۔ زرعی مداخل

یوریا

4 جون: ایف آئی اے کو محکمہ داخلہ نے نیشنل فرٹیلائیزر مارکیٹنگ لمیٹڈ (NFML) کے خلاف 27 بلین روپے کی خرد برد کا مقدمہ دائر کرنے سے روک دیا ہے۔ کمپنی نے ایک بلین ڈالر کا 2.5 ملین ٹن یوریا درآمد کیا تھا مگر صرف 40 فیصد پاکستان کے گوداموں تک پہنچ سکا۔ اطلاعات کے مطابق کمپنی کے افسران نے 390 ملین روپے کی رشوت قبول کی تھی جس کی وجہ سے چمن کے ذریعے درآمدی یوریا افغانستان اسمگل کی گئی (ایکسپریس ٹریبیون، 5 جون، صفحہ 3)۔

20 جون: بیورو آف اسٹیکس کے مطابق اس سال کے پہلے گیارہ مہینوں میں صرف کیمیائی کھاد کی درآمدات میں 111.8 فیصد اضافہ ہوا جس پر کل 1.124 بلین ڈالر خرچ ہوئے جبکہ 2010-11 میں یہ رقم 530.9 ملین ڈالر تھی (دی نیوز، 21 جون، صفحہ 5)۔

27 جون: فرٹیلائزر ڈیولپمنٹ سینٹر کی رپورٹ کے مطابق فرٹیلائزر کا استعمال مئی کے مہینے میں 491,00 ٹن تھا جو پچھلے سال کے مقابلے میں 24 فیصد اور اپریل 2012 کے مقابلے میں 10 فیصد کم ہے۔ فارمرز کی ایشوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر محمد طارق بچانے کہا کہ یہ کمی ثابت کرتی ہے کہ کسان فرٹیلائزر کی قیمت برداشت نہیں کر سکتے اور وہ قدرتی کھاد اور دیگر متبادل طریقوں کی طرف دیکھ رہے ہیں (دی نیوز، جون 28، صفحہ 18)۔

ٹریکٹر

25 اپریل: چیف منسٹر ہاؤس کراچی میں حکومت سندھ کے خوشحال سندھ اور خوشحال ہاری پروگرام کی ایک تقریب میں 18,506 چھوٹے کسانوں میں سے 6,000 کو کمپیوٹرائز

لاٹری کے ذریعے کم قیمت پر ٹریکٹر فراہم کیے گئے۔ یہ اس طرح کی تیسری ٹریکٹر کی تقسیم تھی جس کے تحت 8,376 ٹریکٹر دیئے جا چکے ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 26 اپریل، صفحہ 10)۔

20 جون: اخباری رپورٹ کے مطابق پچھلے چند سالوں میں ٹریکٹر کی قیمت 31,500 روپے سے بڑھ کر 73,500 ہوگئی ہے جس کی وجہ سے کسانوں کے لیے انہیں خریدنا ناممکن ہوگیا ہے لیکن سیلز ٹیکس میں کمی کے بعد سرمایہ کار انہیں منافع کی غرض سے خرید رہے ہیں۔ 2011-12 میں سیلز ٹیکس کو 16 فیصد سے کم کر کے 5 فیصد کر دیا گیا تھا (دی نیوز 20 جون، صفحہ 18)۔

III۔ غربت اور غذائی عدم تحفظ

15 اپریل: وزارت مالیات کی رپورٹ کے مطابق غربت کم کرنے کے اسٹریٹیجی پیپر ii کے تین سالوں میں حکومت نے 3.33 ٹریلین روپے غریب لوگوں سے متعلق 17 شعبوں پر خرچ کیے مگر بڑھتی ہوئی مہنگائی، کمزور معیشت، بار بار سیلاب اور دہشت گردی کے خلاف جنگ اور سیکورٹی کی ابتر صورت حال کی وجہ سے کئی اہداف حاصل نہیں ہو سکے (ڈان، 16 اپریل، صفحہ 12)۔

16 اپریل: اسٹیٹ بینک کی غذائی تحفظ پر رپورٹ میں اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام (WFP) کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ پاکستان کی شہری آبادی کے 50 ملین افراد میں سے 21 ملین غذائی عدم تحفظ میں مبتلا ہیں جبکہ دیہی آبادی کی اکثریت کم خوراکی (malnutrition) اور بھوک (hunger) تک کی صورت حال سے گزر رہی ہے۔ پاکستان کی زیادہ آبادی 17,000 حراروں (calories) سے کم پر گزارہ کر رہی ہے جو عالمی معیار سے بہت کم ہے (دی نیوز، 17 اپریل، صفحہ 15)۔

25 اپریل: ڈائیلوگ آن نیوٹریشن (Dialogue on Nutrition) جسے سیو دی چلڈرن فنڈ نے کراچی میں منعقد کیا، میں نیشنل نیوٹریشن سروے (NNS) 2011 کے حوالے سے کہا گیا کہ سندھ میں ناکافی خوراک کا مسئلہ خاص کر عورتوں اور بچوں میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں 58 فیصد گھرانے ایک سروے کے مطابق غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں جبکہ سندھ میں صرف 28.2 فیصد کو غذائی تحفظ حاصل ہے اور 72 فیصد غذائی عدم تحفظ میں جی رہے ہیں (ڈان، 26 اپریل، صفحہ 17)۔

25 اپریل: اسلام آباد میں ایک سیمینار میں گیلانی حکومت کی زیرو ہنگر ایکشن پلان (Zero Hunger Action Plan) پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے ملک میں عالمی خوراک کے ادارے کے نمائندے نے کہا کہ پاکستان کے کچھ حصوں میں خوراک کے مسائل افریقہ جیسے ہیں۔ انہوں نے حکومت کے پلان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ 16 ملین ڈالر کا یہ پلان ملک میں 61 ملین افراد کے لیے ہے۔ اس پلان میں ناکافی خوراک میں مبتلا بچوں، اسکول کے بچوں اور حاملہ عورتوں کو خاص صحت بخش غذاء فراہم کرنا شامل ہے (ایکسپریس ٹریبیون 26 اپریل، صفحہ 4)۔

17 مئی: بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی چیئر پرسن فرزانہ راجہ نے قومی اسمبلی کو بتایا کہ BISP کے سروے کے مطابق ملک میں 45.7 فیصد افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ امن و عامہ کی صورتحال کی وجہ سے فاٹا کے افراد کو اس سروے کے اعداد و شمار میں شامل نہیں کیا گیا (ایکسپریس ٹریبیون، 18 مئی، صفحہ 11)۔

22 مئی: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے جنوبی پنجاب میں غربت 43 فیصد ہے۔ یہ خطہ جس کی آبادی پنجاب کی 31 فیصد اور رقبہ 48.5 فیصد ہے کو سالانہ ترقی کے پروگرام (ADP) میں صرف 14.7 فیصد حصہ 07-2006 تک ملتا رہا ہے جس کو 10-2009 میں 29.9 فیصد کر دیا گیا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ غذائی تحفظ کے حوالے سے جنوبی پنجاب کا صوبے بننے کا جواز بنتا ہے (دی نیوز، 23 مئی، صفحہ 18)۔

13 جون: آڈیٹر جنرل آف پاکستان نے BISP کے ذریعے رورل سپورٹ پروگرام کو ادا کی گئی رقم میں 1,005 بلین روپے کی گربڑ کا خدشہ ظاہر کیا ہے (دی نیوز، 14 جون، صفحہ 12)۔

غربت کے متضاد اعداد و شمار

4 مئی: پاکستان کے معاشرتی اور معیار زندگی کی پیمائش 11-2010 کے سروے کے مطابق پاکستان میں غربت 2008 میں 17.2 فیصد تھی جو کم ہو کر 2011 میں 12 فیصد رہ گئی ہے۔ یہ بہتری حکومت کی طرف سے فصلوں کی امدادی قیمت بڑھانے، بیرونی ملک مقیم پاکستانیوں کی بھیجی گئی رقم میں اضافے اور سیلاب میں بیرونی امداد کی وجہ سے آئی۔ حکومت خود ان اعداد و شمار کو قبول کرنے سے ہچکچا رہی ہے۔ پاکستان میں افراط زر کی شرح 15 فیصد اور قومی آمدنی میں اضافہ کی شرح 2.6 فیصد ہے۔ اس کے باوجود غربت میں کمی ناسمجھ میں آنے والی بات ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 5 مئی، صفحہ 1)۔

12 مئی: پلاننگ کمیشن نے ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی بنائی ہے جو حکومت کو یہ سفارش پیش کرے گی کہ غربت کے صحیح اندازے کے لیے ماہر معاشیات اور تحقیق کرنے والے کے لیے بنیادی ڈیٹا فراہم کرے (دی نیوز، 13 مئی، صفحہ 15)۔

31 مئی: پاکستان ایکنامک سروے 12-2011 میں غربت کے اعداد و شمار کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مالیات اور ریونیو کے وفاقی وزیر ڈاکٹر حفیظ اے شیخ نے کہا کہ چیئرمین پلاننگ کمیشن یہ اعداد و شمار جلد جاری کریں گے (دی نیوز، 1 جون، صفحہ 1)۔

مائیکرو کریڈٹ

18 مئی: نیشنل بینک کی پریس ریلیز کے مطابق بینک زرعی قرضوں کو دینے میں زرعی ترقیاتی بینک کے بعد سب سے پہلے نمبر پر آچکا ہے۔ اس نے جولائی 2011 تا مارچ 2012 تک 33.013 بلین روپے کے زرعی قرضے 1,76,372 کسانوں کو دیے (ڈان، 19 مئی، صفحہ 9)۔

21 مئی: غربت کم کرنے کی اسٹریٹجی پیپر ii کے مطابق ملک میں غربت کم کرنے پر 11-2008 میں 294.3 بلین روپے خرچ ہوئے اس میں بجٹ میں شامل رقم کے علاوہ دیگر پروگرام اور مائیکرو کریڈٹ سے فراہم کیے جانے والے قرضے بھی شامل ہیں (دی نیوز، 22 مئی، صفحہ 5)۔

19 جون: اسٹیٹ بینک کی اعداد و شمار کے مطابق 12-2011 کے پہلے گیارہ مہینوں میں ملک میں کمرشل بینکوں کے ذریعے زرعی قرضوں کی فراہمی میں 13.11 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ان بینکوں نے اس عرصے میں 255.3 بلین روپے کے قرضے فراہم کیے (دی نیوز، 20 جون، صفحہ 15)۔

IV۔ غذائی فصلیں

گندم کی پیداوار

16 اپریل: محکمہ خوراک کے مطابق اس سال ملک میں گندم کی کل پیداوار 23.86 ملین ٹن متوقع ہے۔ اس میں صوبہ سندھ کی پیداوار کا تخمینہ 4.2 ملین ٹن ہے (دی نیوز، 17 اپریل، صفحہ 18)۔

23 اپریل: عالمی ادارہ برائے خوراک (FAO) کے مطابق اس سال گندم کی پیداوار پچھلے سال کے مقابلے میں ذرا کم ہے لیکن پچھلے پانچ سالوں کی اوسط سے زیادہ ہے (ڈان، 24 اپریل، صفحہ 9)۔

V۔ نقدآور فصلیں

تمباکو

9 جون: منسٹری آف نیشنل فوڈ سیکورٹی کی دورکنی ٹیم کے سروے کے مطابق پاکستان ٹوبیکو بورڈ تمباکو کی فصل پر اٹھنے والے اخراجات اور تعارفی قیمت کے متعین کرنے میں اعداد و شمار کو مسخ کرتے ہوئے ملک بھر کے کاشتکاروں کو عموماً اور خیبر پختونخواہ کے کسان کو خاص طور پر نقصان پہنچا رہی ہے (ڈان، 9 جون، صفحہ 9)۔

15 جون: ایگریکلچر انفارمیشن سینٹر پشاور میں منعقد ہونے والے مشترکہ اجلاس میں پاکستان ٹوبیکو بورڈ، ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ اور تمباکو کے کاشتکاروں کی تنظیم سے وابستہ نمائندوں نے شرکت کی جس میں کسانوں کے نمائندوں نے تمباکو کی 117 روپے فی کلو تعارفی قیمت کو رد کرتے ہوئے 200 روپے فی کلو تعارفی قیمت مقرر کرنے کا مطالبہ کیا (دی نیوز، 15 جون، صفحہ 17)۔

19 جون: پاکستان ٹوبیکو بورڈ نے تمباکو کی قیمت کے تعین کے لیے ایک میٹنگ کی جس میں منسٹری آف کامرس نے تمباکو کاشت کرنے والوں کو یہ مکمل یقین دہانی کرائی کہ 2012 میں قیمت کے تعین کے لیے تمام متعلقہ حصہ داروں سے مشاورت کی جائے گی (ڈان، 19 جون، صفحہ 4)۔

کپاس

4 مئی: 2011 سیزن میں 26 فیصد اضافے کے ساتھ کپاس کی ریکارڈ پیداوار 14.813 ملین گانٹھیں رہیں جب کہ پچھلے سیزن میں 11.698 ملین گانٹھیں تھیں۔ سندھ میں پچھلے سال کی طوفانی بارشوں سے 29.32 فیصد کمی کے ساتھ 2.691 ملین گانٹھیں حاصل ہوئیں جبکہ پنجاب میں ریکارڈ پیداوار سے 53.49 فیصد اضافے کے ساتھ 12.132 ملین گانٹھیں حاصل ہوئیں (ڈان، 4 مئی، صفحہ 9)۔

VI۔ حکومتی انتظام

12 اپریل: پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن کے چیئرمین جاوید کیانی نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سے درخواست کی کہ وہ وفاقی حکومت سے کہہ کر چینی کے اسٹاک کی قدر کے 90-85 فیصد تک بینکوں سے قرضے کی حد بڑھانے کی اجازت لیں۔ اس سے مل مالکان کو کسانوں سے گنا خریدنے کی قیمت ادا کرنے میں آسانی ہوگی (ڈان، 13 اپریل، صفحہ 9)۔

31 مئی: پاکستان ایکانومک سروے 12-2011 کے مطابق حکومت کے 3.4 فیصد کے ٹارگٹ کے مقابلے میں زرعی پیداوار میں 3.1 فیصد اضافہ رہا۔ سال 2010 میں یہ اضافہ 2.4 فیصد تھا (دی نیوز، پہلی جون، صفحہ 1)۔

4 جون: حکومت سندھ نے کمرشل بینکوں کو منع کیا ہے کہ وہ آٹے کے مل مالکان کو حکومت کی طرف سے ذخیرہ کی گئی گندم کے عوض قرضے نہ دیں۔ محکمہ خوراک نے 200-150 آٹا ملوں میں گندم ذخیرہ کروایا ہے (دی نیوز، 5 جون، صفحہ 15)۔

11 جون: صوبہ خیبر پختونخواہ میں محکمہ خوراک نے اس سال گندم کی خریداری کا ہدف 0.325 ملین مٹرک ٹن رکھا ہے جو اب تک 85 فیصد کے قریب حاصل ہو چکا ہے۔ محکمہ خوراک کو امید ہے کہ بہتر انتظام کی وجہ سے صوبائی حکومت کا ہدف حاصل ہو جائیگا (طاہر علی کا مضمون: ڈان، 11 جون، صفحہ III)۔

12 جون: سندھ میں ماہی گیری کے وزیر نے کہا کہ زراعت کے فروغ اور کسانوں کی بھلائی کے لیے صوبائی سالانہ ترقیاتی پلان میں 10.9 بلین روپے رکھے گئے ہیں۔ حسن عسکری جو سندھ میں چھوٹے کسانوں کی تنظیم کے جنرل سیکریٹری ہیں نے کہا کہ سندھ بینک سے کسانوں کو 2 بلین روپے کے قرضے دیے جائیں گے تاکہ وہ سیلاب کی تباہی کے اثرات سے نمٹ سکیں۔ اس کے علاوہ سستے دام ٹریکٹر دینے کی اسکیم سے بھی کسانوں کو فائدہ ہوگا پچھلے سال 6,000 ٹریکٹر دیے گئے تھے اس سال 18,000 ٹریکٹر اس اسکیم کے ذریعے خریدے جا سکتے ہیں۔ سندھ چیمبر آف ایگری کلچر کے محمد خان ساریجو نے نہروں اور نالوں کی صفائی کے نظام کو بہتر بنانے پر خرچ کی جانے والی رقم کو دگنا کرنے کے اقدام کی تعریف کی۔ سالانہ ترقیاتی پروگرام کے بجٹ میں 7.5 بلین روپے اس کام کے لیے رکھے گئے ہیں (ڈان 13 جون، صفحہ 18)۔

سندھ میں گندم کی خریداری

12 اپریل: سندھ آبادگار بورڈ کے صدر عبدالمجید نظامانی نے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ حکومت گندم خریدنے کے سینٹر قائم کرے، گندم بیچنے کے لیے بوریاں (باردانہ) فوری فراہم کرے اور گندم خریدنے کے ہدف کو 2 ملین ٹن تک بڑھائے کیونکہ کاشتکاروں کی اچھی فصل کی امید ہے۔ حکومت کے اس سال کا گندم خریدنے کا ٹارگٹ 1.3 ملین ٹن مقرر کیا ہے جبکہ پچھلے سال یہ ہدف 1.5 ملین تھا۔ سندھ آبادگار بورڈ نے ہمیشہ سے یہ زور دیا ہے کہ سندھ میں گندم خریدنے کی تاریخ مارچ کے آخری ہفتے میں رکھی جائے اور 15 مارچ تک کسانوں کو گندم کی خالی بوریاں تقسیم کر دی جائیں۔ اس کام میں تاخیر کی وجہ سے تاجر محکمہ خوراک کے تعاون سے کسانوں سے کم قیمت میں گندم خریدتے ہیں۔ حکومت نے اس سال گندم کی قیمت 1,050 روپے فی 40 کلو مقرر کی تھی جبکہ تاجر 950 روپے فی 40 کلو خرید رہے ہیں۔ اس خبر کے مطابق جنوبی سندھ میں اب تک 50,000 ٹن گندم بیچی جا چکی ہے (ڈان، 13 اپریل، صفحہ 18)۔

14 اپریل: اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے پاکستان ایگریکلچر اسٹوریج سرویسز (پاسکو) کے جنرل منیجر تنویر حسین نے کہا کہ پاسکو گندم کی بوریاں پہلے دس دنوں میں ان کسانوں کو دے گی جن کے پاس 12 ایکڑ سے کم زمین ہے اور یہ کام اپریل کے آخری ہفتے میں شروع ہوگا جبکہ پہلی مئی سے گندم کی خریداری شروع کی جائے گی (دی نیوز، 15 اپریل، صفحہ 18)۔

23 اپریل: پاسکو کے مطابق حالیہ بارش سے گندم میں نمی آ گئی جس کی وجہ سے بوریوں کی تقسیم اب 25 اپریل سے ہوگی (دی نیوز، 24 اپریل، صفحہ 18)۔

سندھ میں گندم کی بوریوں کی تقسیم

- 90,000 بوریاں سکھر اور روہڑی کے گوداموں سے غائب ہو چکے ہیں۔ جنہیں آٹے کے مل مالکان کو کمیشن پر بیچا گیا (ڈان، 21 اپریل، صفحہ 18)۔
- میر پور خاص میں پولیس نے آٹے کی مل کے مالک اور ان کے بیٹے کو خوراک کیا سسٹنٹ کنٹرولر کی شکایت پر گرفتار کیا۔ اس مل میں محکمہ خوراک نے ایک معاہدے کے تحت 20 اپریل کو 820,140 بوریوں کو رکھوایا تھا مگر اس میں سے 34,417 بوریاں گنتی کرتے وقت کم تھیں۔ دونوں مجرموں نے کہا کہ انہوں نے 94.839 ملین روپے بوریاں بیچ کر کمائے۔ مگر انہوں نے یہ بھی کہا 76,000 بوریاں جو گودام میں تھیں وہ محکمہ خوراک کے اسسٹنٹ کنٹرولر اور 24,000 خوراک کے انسپیکٹر کے زیر انتظام میں تھیں وہ بھی غائب ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے محکمہ خوراک کے افسران کو ذمہ دار ٹھہرایا (ڈان، 23 اپریل، صفحہ 16)۔
- سندھ حکومت نے کل 0.7 ملین تھیلے مختلف اضلاع میں تقسیم کیے۔ وزیر خوراک کے کہنے پر 55,000 بوریاں ایک ایم این اے اور 35,000 بوریاں ایک ایم پی اے کو دیے گئے (دی نیوز، 26 اپریل، صفحہ 2)
- کسان بورڈ آف پاکستان نے حکومت سے فی کسان فی ایکڑ 8 تھیلوں کے بجائے 15 تھیلوں کی درخواست کی۔ ایک تھیلے میں تقریباً 100 کلو گندم آ سکتی ہے (دی نیوز، 29 اپریل، صفحہ 18)۔

گندم کی خریداری پر کسانوں کا کل نقصان

25 مئی: فارمرز ایسوسی ایشن آف پاکستان کے مطابق گندم کے کاشتکاروں کو گندم کے بوریوں کی عدم دستیابی اور نامناسب خریداری کی پالیسی کی وجہ سے سرکاری گندم کی خریداری کی مہم کے دوران 15-10 بلین روپوں کا نقصان ہوا۔ محکمہ خوراک اور پاسکو نے سرکاری قیمت کے بجائے گندم 925-900 روپے فی 40 کلوگرام پر خریدی اور اس پر بھی گندم میں نمی، معیار اور دیگر بہانوں سے قیمت کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی (دی نیوز، 26 مئی، صفحہ 5)۔

پنجاب میں گندم کی خریداری

9 اپریل: پاسکو کے مطابق اس سال پہلی دفعہ اس نے ایک تجرباتی منصوبہ میاں چنوں، خانیوال میں بنایا ہے جس کے تحت حکومت ان کاشتکاروں سے سب سے پہلے گندم خریدے گی جنہوں نے زرعی ترقیاتی بینک سے قرضے لیے ہوئے ہیں۔ گندم کی خریداری کی رقم حکومت بینک کی برانچ میں جمع کرائے گی۔ بینک قرض کی رقم کاٹ کر کسان کو باقی پیسہ واپس کر دے گا۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو اسے پنجاب کے دوسرے علاقوں میں بھی اگلے سالوں میں پھیلایا جائے گا (دی نیوز، 10 اپریل، صفحہ 10)۔

20 اپریل: پنجاب میں کسانوں سے گندم کی خریداری کی حکومتی مہم 15 اپریل سے شروع ہونی تھی اس تاریخ کو بارش کی وجہ سے مزید دس دن بڑھایا گیا۔ محکمہ خوراک نے 375 گندم خریدنے کے مرکز قائم کیے جہاں سے 1,050 روپے فی 40 کلوگرام حکومتی امدادی قیمت پر 3.5 میٹرک ٹن گندم 2012 کے لیے خریدی جائے گی (ایکسپریس ٹریبیون، 21 اپریل، صفحہ 11)۔

21 اپریل: ایک خبر کے مطابق پچھلے سال کی طرح اس سال بھی کروڑوں روپے کی گندم جو حکومت خریدے گی اسے کھلی جگہوں پر رکھا جائے گا کیونکہ صوبائی حکومت نے ابھی تک گندم ذخیرہ کرنے کا مناسب انتظام نہیں کیا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 22 اپریل، صفحہ 11)۔

17 مئی: پنجاب فلور ملز ایسوسی ایشن نے حکومت کی گندم کی امدادی قیمت 1050 روپے تک بڑھانے کی وجہ سے آٹے کی قیمت 4.25 روپے فی کلو بڑھا دی (ایکسپریس ٹریبیون 18 مئی، صفحہ 2)۔

29 مئی: پنجاب نے سرکاری گندم خریداری کی مہم کے اختتام پر کہا کہ حکومت نے 2.9 ملین ٹن گندم خریدی جو حکومتی ٹارگٹ سے کم ہے۔ کسانوں نے کہا کہ حکومت نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے لیکن حکومتی افسران یہ کہہ کر بات ٹال رہے ہیں کہ پیداوار کسانوں کے دعوؤں سے کم تھی۔ بہرحال اس کم خریداری سے حکومت پنجاب نے 18 بلین روپے بچا لیے (ڈان، 30 مئی، صفحہ 2)۔

زرعی ٹیکس

25 مئی: ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے وفاقی وزیر مالیات ڈاکٹر حفیظ شیخ نے کہا کہ صوبوں کو ساتھ بیٹھ کر زرعی انکم ٹیکس کے حوالے سے کسی متفقہ موقف کو اختیار کرنا چاہیے۔ دستور کے مطابق اس معاملے میں دخل اندازی کا حق وفاقی حکومت کو حاصل نہیں جبکہ اقتصادی ماہر قیصر بنگالی نے کہا کہ حکومت دستور میں ایک ترمیم سے یہ حق لے کر ملک میں یکساں زرعی ٹیکس نافذ کر سکتی ہے (دی نیوز، 26 مئی، صفحہ 8)۔

30 مئی: ایک خبر کے مطابق پنجاب کی حکومت نے زرعی ٹیکس وصول کرنے کے لیے نئے اقدام کیے ہیں جس سے 7000 کے قریب نئے زمینداروں کو ٹیکس نیٹ میں شامل کیا جائے گا (دی نیوز، 31 مئی، صفحہ 15)۔

4 جون: سندھ چیمبر آف ایگری کلچر کے صدر ڈاکٹر ندیم قمر نے کچھ حلقوں کی طرف سے زرعی آمدنی پر ٹیکس عائد کرنے کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اس سے تمام زرعی آبادی کو انکم ٹیکس کا محکمہ اپنا اسیر بنا لے گا۔ انہوں نے کہا کہ کسان پہلے ہی زرعی مشینری اور دیگر مداخل پر ٹیکس ادا کر رہے ہیں (ڈان، 5 جون، صفحہ 18)۔

4 جون: سینیٹر اسحاق ڈار نے وفاقی بجٹ پر بحث میں کہا کہ ان کی پارٹی زرعی شعبے پر ٹیکس لگانے کے حق میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ قانون کے تحت مالیاتی سال 12-2011 میں پنجاب میں ایک بلین جبکہ حکومت سندھ نے صرف 300 ملین روپے زرعی ٹیکس وصول کیا (ایکسپریس ٹریبیون، 5 جون، صفحہ 9)۔

6 جون: سینیٹ میں بجٹ پر بحث کے دوران پیپلز پارٹی کے سینیٹر سعید غنی نے کہا کہ ان کی پارٹی سال 13-2012 میں زرعی انکم ٹیکس لگانے کا کوئی ادارہ نہیں رکھتی (ایکسپریس ٹریبیون، 7 جون، صفحہ 12)۔

11 جون: بجٹ 13-2012 کے مطابق زرعی انکم ٹیکس کی ادائیگی میں پنجاب میں پچھلے کئی سالوں سے کمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ سال 12-2011 میں حکومت پنجاب نے 927.18 ملین روپے کا ٹارگٹ رکھا تھا جبکہ کل ٹیکس 712.42 ملین روپے ہی ادا کیا گیا۔ 11-2010 میں حکومتی ٹارگٹ 1.2 بلین روپے تھا اور 13-2012 کے لیے صرف 720 ملین روپے کا ٹارگٹ رکھا گیا ہے (دی نیوز، 11 جون، صفحہ 3)۔

VII۔ صنعتی زراعت اور آزاد تجارت

برآمدات

4 مئی: جنگ ایکنامک فورم میں ماہرین نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت قومی آمدنی میں اضافے کی شرح زرعی فصلوں کی پیداوار بڑھا کر بڑھائے تاکہ پاکستان زرعی اشیاء برآمد کرنے والا ملک بن جائے (دی نیوز، 5 مئی، صفحہ 5)۔

28 جون: پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ زراعت میں خود انحصاری کے لیے پیداوار میں اضافے کی ضرورت ہے اور یہ کام جدید زرعی ٹیکنالوجی سے ہی ممکن ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے لیے 2 بلین روپے کا خاص فنڈ قائم کیا گیا۔ حکومت پنجاب اور چین کی اسٹار فارم کمپنی کے تعاون سے زرعی اشیاء کی فروغ کے ساتھ کسانوں کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے گا۔ اسٹار فارم نیٹ ورک سے پاکستانی زرعی اشیاء اور مال مویشی کی برآمدات میں بھی اضافہ ہوگا (دی نیوز، 29 جون، صفحہ 5)۔

گندم:

4 مئی: کابینہ کی اقتصادی رابطہ کمیٹی (ای ای سی) نے ایک ملین ٹن گندم کے بدلے ایران سے خریف کے موسم کے لیے یوریا خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔ (ڈان، 5 مئی، صفحہ 9)۔

19 مئی: ایک خبر کے مطابق سندھ حکومت نے درآمدی گندم کے بقایاجات جو کل ملا کر 3.5 بلین بنتے ہیں ٹریڈنگ کارپوریشن (TCP) کو ادا نہیں کیے۔ سندھ حکومت کا موقف ہے کہ 2009 میں جب سندھ کو گندم کی ضرورت تھی تب TCP نے گندم فراہم نہیں کی۔ بعد میں جب گندم آئی تو سندھ کے پاس اپنی مقامی گندم کی فصل موجود تھی۔ سندھ حکومت گندم ذخیرہ کرنے کے 882 ملین روپے ادا کرنے کو بھی تیار نہیں ہے (دی نیوز، 20 مئی، صفحہ 16)۔

چاول:

19 اپریل: ملیشیاء میں پاکستانی ہائی کمیشنر نے کہا کہ دو سالوں سے ملیشیا کے لیے پاکستانی چاول کی برآمدات میں 243 فیصد اضافہ ہوا ہے کیونکہ ملیشیاء تھائی لینڈ اور ویت نام میں سیلاب کی وجہ سے چاول نہیں خرید رہا ہے۔ پاکستان کے پاس اپنی ضرورت کے بعد 2.5 ملین ٹن برآمد کے لیے وافر چاول ہے جس میں سے 2010 میں ملیشیا کو 123,000 ملین ٹن برآمد کیا گیا جبکہ 2009 میں یہ مقدار 43,000 ٹن تھی (ایکسپریس ٹریبیون، 20 اپریل، صفحہ 10)۔

15 مئی: پاکستانی کسانوں کا رجسٹرڈ ادارہ باسمتی گروورز ایسوسی ایشن نے فلپائن کے محکمہ زراعت کو خط کے ذریعے یہ باور کروایا ہے کہ باسمتی پاکستان کی جغرافیائی حدود میں کاشت کیا جانے والا چاول ہے جسے عالمی تجارتی ادارے کے ٹرپس کے معاہدے کے تحت عالمی تجارت میں قانونی تحفظ حاصل ہے لہذا فلپائن اس نام سے اپنے چاول نہیں بیچ سکتا (دی نیوز، 16 مئی، صفحہ 18)۔

7 جون: ایک اخباری مضمون کے مطابق مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے پاکستانی چاول مشرق وسطیٰ برآمد نہیں ہو پا رہا جہاں ہندوستان اپنے سستے چاول سے مارکیٹ پر چھا رہا ہے۔ ہندوستان نے باسمتی کو برآمد کرنے کی پابندی اکتوبر 2011 میں ہٹائی اور پچھلے چار مہینوں میں اپنے روپے کی قدر میں 20 فیصد کمی بھی کی۔ اس کے باوجود یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ چین سے آزاد تجارت کے معاہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان 2 بلین ڈالر کی چاول برآمدات کا ہدف حاصل کرے گا لیکن ایران جو پاکستانی چاول کی بڑی مارکیٹ ہے وہاں بینکنگ سہولت نہ ہونے کی وجہ سے چاول کی برآمد ممکن نہیں (دی نیوز، 7 جون، صفحہ 18)۔

چینی:

3 مئی: حکومت نے مل مالکان کو چینی کی برآمد کرنے کی اجازت پچھلے تین مہینوں میں دوسری دفعہ دی ہے جس کے تحت 200,000 ٹن چینی برآمد کی جاسکے گی جبکہ حکومت نے خود کچھ اسٹاک مقامی طور پر استعمال کے لیے بھی خریدے ہیں۔ پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن کے چیئرمین اسکندر خان نے کہا کہ اس فیصلے سے مل مالکان کاشتکاروں کو 30 بلین روپے کے بقایاجات ادا کرسکیں گے۔ یہ اجازت بین الاقوامی مارکیٹ میں چینی کی قیمت گرنے کے باوجود دی گئی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 4 مئی، صفہ 10)۔

ایتھنول:

28 مئی: صوبہ سندھ کی سات اور پنجاب کی آٹھ ڈسٹلریز (distilleries) راب یعنی مولیسیز (molasses) سے ایتھنول بنا رہی ہیں جس سے سال میں اوسطاً 2.2 ملین ٹن ایتھنول پیدا کیا جارہا ہے۔ رواں سال گنے کی ریکارڈ 55 ملین ٹن پیداوار سے 2.50 ملین ٹن ایتھنول حاصل کیا گیا ہے جس سے 975 ڈالر فی ٹن کے حساب سے 245 ملین ڈالرز کا زرمبادلہ کمایا گیا ہے (ڈان، 28 مئی، صفحہ IV)۔

آم:

31 مئی: ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مقامی اور بیرونی کمرشل ایئر لائینز نے فریٹ ریٹ دوگنے کردیے ہیں جس کی وجہ سے آم برآمد کرنے میں اب کوئی فائدہ نہیں (دی نیوز، پہلی جون، صفحہ 17)۔

9 جون: پاکستان ہوٹیفریش پروسسنگ پرائیوٹ لمیٹڈ کے چیف ایگزیکٹیو نے پاکستان کے پہلے گرم پانی کے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگائے جانے کے موقع پر کہا کہ اس سے ملک میں آموں کی برآمدات کے فروغ میں بہت اضافہ ہوگا (ایکسپریس ٹریبیون، 10 جون، صفحہ 11)۔

تمباکو:

17 اپریل: پاکستان ٹوبیکو بورڈ کی رپورٹ کے مطابق 2011 میں تمباکو کی پیداوار 14 ملین کلو گرام رہی جب کہ سال 2009 میں تمباکو کی پیداوار 4 ملین کلوگرام تھی۔ سال 2010 میں ملک نے 5 ملین کلوگرام تمباکو کی برآمد سے 36 ملین ڈالر کا زرمبادلہ کمایا جب کہ سال 2011 میں تمباکو کی برآمد سے 105 ملین ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوا (دی نیوز، 17 اپریل، صفحہ 18)۔

درآمدات

3 جون: وفاقی حکومت کی پالیسی کے خلاف پاکستان متحدہ کسان محاذ (PMKM) کے چیئرمین

نے کہا کہ خوراک کی درآمد سے مقامی زراعت کو تباہ کرنے کا پلان بنایا گیا ہے، اس سے ملک کی خود انحصاری کو خطرہ لاحق ہے۔ مداخل کی قیمتوں میں اضافے اور زرعی سبسیڈی کو ہٹانے سے اب کسان کو کوئی فائدہ نہیں (دی نیوز، 4 جون، صفحہ 3)۔

پھل:

16 مئی: ایک رپورٹ کے مطابق درآمدی پھل کی قیمت 400-240 فی کلو تک ہے جس نے یہ پھل عام لوگوں کی خرید سے باہر کر دیا ہے (ڈان، 17 مئی، صفحہ 9)۔

بیرونی دلچسپی اور امداد

19 اپریل: پلاننگ کمیشن کے مطابق حکومت سندھ نے چین کے ساتھ مل کر ٹنڈو جام میں مقامی کسانوں کو نئے زرعی طریقوں سے آگاہی کے لیے زرعی مظاہرے کے علاقے (agricultural demonstration zones) قائم کیے ہیں (دی نیوز، 20 اپریل، صفحہ 19)۔

19 اپریل: پلاننگ کمیشن کے مطابق جاپانی بین الاقوامی تعاون کی ایجنسی نے گلگت اور بلتستان میں سیب اور خوبانی میں ویلیو ایڈیڈ (value added) کاروبار کے لیے 437 ملین روپے کی امداد فراہم کرنے کی رضامندی ظاہر کی ہے۔ اس تعاون سے بہتر ٹیکنالوجی کا بھی فروغ ہوگا (دی نیوز، 20 اپریل، صفحہ 18)۔

3 جون: ایک رپورٹ کے مطابق اچھے زرعی طریقوں کو فروغ دیتے ہوئے آسٹریلیا کے بینگو ویلیو چین امپرومنٹ پروجیکٹ کے تحت رحیم یار خان میں کئی کاشتکار آموں کو 10 منازل سے گزار کر انہیں زیادہ دیر تک تازہ رکھنے کا تجربہ کر رہے ہیں (ڈان، 4 جون، صفحہ 15)۔

VIII۔ کارپوریٹ سیکٹر

یوریا کی کمپنیاں

19 مئی: 2012 کے پہلے چار مہینوں میں سوئی گیس (ناردرن اور سدرن) نیٹ ورک پر گیس کی بندش سے یوریا کمپنیوں کے منافع میں 53 فیصد کمی ہوئی (دی نیوز، 20 مئی، صفحہ 14)۔

21 مئی: ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان نے امریکی کمپنی Gavilon Fertilizer کے ساتھ 100,000 میٹرک ٹن یوریا 522.86 ڈالر فی ٹن کے حساب سے درآمد کرنے کا معاہدہ طے کیا (ڈان، 22 مئی، صفحہ 9)۔

28 مئی: اپریل 2012 میں حکومتی سبسیڈی کی وجہ سے درآمدی یوریا کی سیل 51 فیصد جبکہ مقامی یوریا کی سیل 49 فیصد رہی (ایکسپریس ٹریبیون، 29 مئی، صفحہ 10)۔

29 جون: ایک اخباری خبر کے مطابق 12-2011 فرٹیلائزر کی قیمت بڑھانے پر کمپیٹیشن کمیشن آف پاکستان نے تمام سات فرٹیلائزر کمپنیوں کو شوکاز نوٹس جاری کر دیے ہیں (دی نیوز، 29 جون، صفحہ 15)۔

29 جون: سندھ چیمبر آف ایگریکلچر نے کمپیٹیشن کمیشن آف پاکستان (سی سی پی) کی رپورٹ کی تعریف کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ یوریا کمپنیوں کی طرف سے قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے کاشتکاروں کے نقصان کا ازالہ کرے۔ سی سی پی کی انکوائری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دسمبر 2010 تا 2011 تک فرٹیلائزر کی قیمتوں میں 850 روپے فی بیگ سے 1580 روپے فی بیگ (بلکہ اس سے بھی زیادہ) اضافہ ہوا جس کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اضافہ پچھلے 20 سالوں میں سب سے زیادہ تھا (ڈان، 30 جون، صفحہ 18)۔

یو ایس ایڈ اور یو ایس ڈی اے

13 اپریل: پاکستان میں پھل اور سبزی کی پیداوار کے حوالے سے یو ایس ایڈ کے ایگری سپورٹ فنڈ (اے ایس ایف) کے ذریعے اچھی زراعت کے فروغ Good Agricultural Practisces (جی اے پی) کے لیے ایک ٹیکنیکل ورکنگ گروپ تشکیل دیا ہے جو عالمی سطح پر قائم جی اے پی کے سیکریٹریٹ اور کمیٹیوں کے ساتھ قریبی تعاون کے ساتھ کام کرے گا۔ ایسے 10 بڑے منصوبوں پر کام کرنے کا ارادہ ہے جبکہ اے ایس ایف کے ذریعے پچھلے پانچ سالوں سے آم اور کینوں وغیرہ کی پیداوار اور برآمد کے لیے کاشتکاروں کو ٹیکنیکل اور مالی امداد فراہم کی جا رہی تا کہ ان اشیاء کو عالمی معیار کا سرٹیفکیشن حاصل ہو سکے۔ ان اقدام سے پاکستان کو یورپین مارکیٹ میں ان اشیاء کی برآمدات بڑھانے میں مدد ملی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 4 اپریل، صفحہ 10)۔

20 اپریل: فیصل آباد زرعی یونیورسٹی کے دورے کے دوران امریکی ایمبیسی کے ڈپٹی ایگریکلچر کونسلر ڈیوڈ ولف نے کہا کہ یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف ایگریکلچر (یو ایس ڈی اے) اپنے ترقیاتی منصوبوں کے فنڈز اور زرعی تحقیق کے ذریعے پاکستان کے زرعی شعبے کی ترقی کے لیے کام کرتا رہے گا۔ امریکی ترقیاتی منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ منصوبے زرعی مارکیٹ کو ترقی دینے، تجارت، خوراک کے تحفظ، جدید ریسرچ اور ٹیکنالوجی میں تعاون اور پائیدار زراعت کے لیے ہیں۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کہا کہ یونیورسٹی 150 زرعی پروجیکٹ امریکی امداد سے چلا رہی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 21 اپریل، صفحہ 10)۔

4 مئی: یونیورسٹی آف ایگریکلچر فیصل آباد اور امریکی محکمہ زراعت کی 5 روزہ مشترکہ ورک شاپ کے آخری دن مقررین نے کہا کہ پاکستان، افغانستان اور امریکہ کے مابین زراعت کے حوالے سے تعلقات کے فروغ سے زراعت سے وابستہ لوگوں کی مشکلات بہت حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ اس ورکشاپ میں کو بتایا گیا کہ خوراک کے تحفظ، زراعت، انرجی اور پانی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے یو ایس ایڈ پاکستان میں تین اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کر رہی ہے۔ فیصل آباد یونیورسٹی کو خوراک کے تحفظ اور زراعت کے حوالے سے چنا گیا ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 5 مئی، صفحہ 10)۔

24 مئی: ایو ایس ایڈ کے مطابق سندھ کے سات آم کے باغوں سے دنیا بھر کی بڑی مارکیٹوں میں آم اس سال جون میں بھیجے جانے کو تیار ہیں۔ جیسے جیسے فصل تیار ہوگی آم کے باغوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ یو ایس ایڈ کا آم پروگرام اس وقت اپنے تیسرے سال میں ہے۔ یہ پروگرام پاکستانی آم کو بین الاقوامی مارکیٹ میں متعارف کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یو ایس ایڈ نے پاکستان بھر میں 15 آم کے کاشتکاروں سے انفرااسٹرکچر اپ گریڈ یعنی بہتر کرنے کے معاہدے کیے ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 24 مئی، صفحہ 11)۔

20 جون: یو ایس ایڈ کے ریجنل منیجر نے حیدرآباد میں کہا کہ یو ایس ایڈ کا نیا ایگری بزنس پروجیکٹ مال مویشی اور ہورٹیکلچر ویلیو چینز کے ذریعے برآمدات کے فروغ سے 1.3 ملین لوگوں کو روزگار فراہم کرے گا جس سے غربت میں کمی آئے گی (دی نیوز، 21 جون، صفحہ 17)۔

13 جون: پچھلے سال شروع کیے گئے یو ایس ایڈ ایکشن پروگرام کی وجہ سے سندھ سے سندھری آم کی یورپ برآمد کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے (ڈان، 14 جون، صفحہ 18)۔

دودھ کی کمپنیاں

8 مئی: عیسلے کمپنی نے اپنی من مانی کرتے ہوئے آدھا لیٹر دودھ کے ڈبے پر 5 روپے اور ایک لیٹر دودھ کے ڈبے پر 10 روپے بڑھا دیے۔ کمپنی نے جنوری 2009 میں ایک لیٹر دودھ کی قیمت 55 روپے سے بڑھا کر دسمبر 2009 میں 58 روپے کر دی۔ جنوری 2011 میں ایک لیٹر دودھ کی قیمت 70 روپے تھی جسے نومبر 2011 میں بڑھا کر 80 روپے کر دیا گیا (ڈان، 8 مئی، صفحہ 9)۔

14 مئی: ایک خبر کے مطابق ایگرو فوڈز روزانہ 102 ملین لیٹر دودھ میں سے صرف 5 فیصد اپنے سکھر ڈیری فارم سے حاصل کرتا ہے۔ دودھ کی باقی خرید تقریباً 15,000 چھوٹے کسانوں کی مدد سے ممکن ہوتی ہے جو ضلع سانگھڑ سے لے کر ضلع جھنگ تک آباد ہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 14 مئی، صفحہ 10)۔

پانی کی کمپنیاں

15 اپریل: پاکستان کاؤنسل آف ریسرچ ان واٹر ریسورسز (PCRWR) کی طرف سے جاری کی گئی سہ ماہی رپورٹ میں 12 منرل واٹر کمپنیوں کے پانی کو آلودہ قرار دیا گیا ہے (ڈان، 16 اپریل، صفحہ 12)۔

بیج کی کمپنی

9 اپریل: فلپائن میں سوبیک بے کے مقام پر کسانوں کے چھٹے پین ایشین تبادلے کے پروگرام کے اختتام پر جاری اعلامیے کے مطابق پاکستان، تھائی لینڈ اور انڈونیشیاء نے بائیو ٹیکنالوجی کو اپنانے میں محتاط رویہ اختیار کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے زرعی پیداوار بڑھانے میں یہ ممالک پیچھے رہ گئے ہیں جبکہ فلپائن، چین اور ہندوستان اس حوالے سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس پروگرام کے ایک سیشن میں پاکستان میں مونسانٹو کے کمرشل نمائندے الیاس ندیم نے کہا کہ پاکستان میں تمام کپاس غیر تصدیق شدہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تصدیق شدہ جینیاتی بیج کا استعمال پاکستان میں ممکن نہیں۔ جینیاتی مکئی کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ ملک میں فلڈ ٹرائل ہو چکے ہیں اور ضروری کاروائی کے بعد جینیاتی مکئی کی اجازت دے دی جائے گی (دی نیوز، 10 اپریل، صفحہ 18)۔

IX۔ ماہی گیری

17 مئی: عالمی ماحولیاتی ادارے ڈبلیو ڈبلیو ایف کے سائیٹ منیجر نے حکومت سندھ کی مزمت کرتے ہوئے کہا کہ ٹھٹھہ میں 20 ہزار ایکڑ پر مشتمل سمندر فشریز اکانومک زون بیرونی سرمایہ کاری کے حوالے کیا ہے اس میں مقامی ماہی گیر گروپ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا (دی نیوز، 18 مئی، صفحہ 19)۔

X۔ مال مویشی

4 اپریل: ایک خبر کے مطابق پاکستان میں توانائی بحران کی وجہ سے سرمایہ کار صنعتوں کے متاثر ہونے کے بعد متبادل سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ جس میں ڈیری شعبہ نمایاں ہے جس کے لیے زیادہ دودھ دینے والی گائے کی درآمد بڑھتی جا رہی ہے، پاکستان کے صوبہ پنجاب میں مشہور کاروباری خاندان اس شعبے میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں جن میں جہانگیر ترین، شریف برادران اور گجرات کے چودھری بھی شامل ہیں (ڈان، 4 اپریل، صفحہ 18)۔

12 مئی: سیکریٹری جنرل برائے حلال ڈیولپمنٹ کونسل اسد سجاد کے مطابق حلال مصنوعات کی پیداوار کے اعتبار سے پاکستان موضوع ترین ملک ہے۔ تاہم اب تک حلال مصنوعات برآمد کرنے والے تقریباً تمام تر ممالک غیر مسلم ہیں جس میں برازیل، امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فرانس، تھائی لینڈ اور ہندوستان شامل ہیں (دی نیوز، 12 مئی، صفحہ 18)۔

12 مئی: ایک خبر کے مطابق ہر ماہ تقریباً ایک لاکھ مویشی ایران اور افغانستان کی طرف اسمگل کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے مقامی مارکیٹ میں چھوٹے اور بڑے گوشت کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے (ڈان، 13 مئی، صفحہ 11)۔

16 مئی: نیشنل اسٹینڈنگ کمیٹی ان نیشنل فوڈ سیکورٹی اینڈ ریسرچ نے اپنے ایک اعلامیے میں بتایا ہے کہ حکومت نے اس سال 2,13,000 مویشی برآمد کرنے کی اجازت دی ہے جبکہ اب تک 15,000 ہزار مویشی برآمد کیے گئے ہیں (دی نیوز، 16 مئی، صفحہ 18)۔

مونسانٹو اور پاکستان

مونسانٹو کے نمائندے عامر محمود مرزا کے مطابق پاکستان میں آبادی میں تیزی سے اضافے کی وجہ سے غذائی عدم تحفظ کی صورتحال پیدا ہو رہی ہے۔ اس مسئلے کو بائیو ٹیکنالوجی دور کر سکتی ہے لہذا پاکستان میں فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ پاکستان کو زرعی ٹیکنالوجی کے ذریعے زرعی پیداوار بڑھانے کا ایک واضح روڈ میپ (road map) چاہیے۔

سبزی کے بیج کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ پاکستان ہر سال 94 فیصد سبزی کے بیج درآمد کرتا ہے جو سالانہ 5.5 ملین ٹن کے قریب ہوتے ہیں۔ جی ایم مکئی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومتی رضاء مندی کے بعد پنجاب میں فیلڈ ٹرائل ہو چکے ہیں۔ حکومت پنجاب نے ہر مرحلے کو خود مانیٹر کیا۔ بی ٹی کاٹن کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ بات چیت فیل نہیں ہوئی سست ہو گئی ہے۔ حکومت پنجاب نے معاہدہ ختم کرنے کی کوئی اطلاع مونسانٹو کو نہیں دی۔ انہوں نے کہا کہ مونسانٹو اب بولگارڈ II (Bollguard II) بیج کے فروغ پر کام کر رہا ہے۔

پاکستان میں مونسانٹو کی بزنس کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ کمپنی کی پوزیشن یہاں بہت مضبوط ہے۔ ڈی کیب (DEKALB) اور ایسگرو (Asgrow) کے بیج کی برانڈ اس کے پاس ہیں اور روانڈ اپ ہربیسائڈ (Roundup herbicide) کا نیٹ ورک پاکستان بھر میں کسانوں تک پہنچ چکا ہے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ مونسانٹو پاکستان میں پہلی زرعی کمپنی ہے جس نے بیج بزنس کے تمام بنیادی شعبوں میں سرمایہ کاری کی ہے مثلاً ریسرچ، پیداوار، پروسسنگ، معیار کی ضمانت اور موبائل مارکیٹنگ وغیرہ۔ مونسانٹو نے پاکستان میں اکتوبر 1998 میں قدم رکھا۔ کارگل انٹرنیشنل بیج آپریشن کو خریدنے کے بعد پھر ڈی کیب جینیٹکس (DEKALB Genetics) اور ایسگرو کے دنیا میں پھیلے بزنس کو خرید کر دنیا کی اعلیٰ جینیاتی اشیاء کی پاکستان تک رسائی ممکن بنائی (دی نیوز، 19 اپریل، صفحہ 17)۔

XI۔ ماحولیاتی بحران

جنگلات

20 اپریل: ایک خبر کے مطابق چاروں صوبوں میں جنگلات کی زمین کے ہتھیانے کے 289 واقعات کے جائزہ لینے کے معاملے کو قومی پالیسی برائے ماحولیاتی تبدیلی کے ڈرافٹ سے نکال دیا گیا ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق پنجاب جنگلات کی زمین کی ہتھیانے میں سرفہرست رہا جہاں کل 99,711 ایکڑ زمین، سندھ میں 27,874 ایکڑ، بلوچستان میں 13,693 ایکڑ، خیبر پختونخواہ میں 9,692 ایکڑ جبکہ آزاد جموں کشمیر میں 577 ایکڑ زمین بااثر لوگوں اور مختلف نجی اداروں کو منتقل کردی گئی (دی نیوز، 20 اپریل، صفحہ 5)۔

11 جون: ایک اخباری رپورٹ کے مطابق حکومت پنجاب نے وفاقی حکومت سے ایک پرائیویٹ کمپنی کے خلاف مارگلہ کی پہاڑیوں اور بنی گالا کے جنگلات کی زمین ہتھیانے کی شکایت کی ہے۔ یہ زمین سی ڈی اے کو لیز پر دی گئی تھی جس کی مدت 30 جون 1981 اور 30 جون 1991 کو ختم ہوگئی۔ اس کے بعد یہ زمین نہ تو پنجاب کی حکومت کو واپس کی گئی اور نہ لیز کی مدت بڑھائی گئی (انصار عباسی کا مضمون: دی نیوز، 11 جون، صفحہ 5)۔

مارگلہ کے جنگلات کا کل رقبہ
11,870 ایکڑ
بنی گالا کے جنگلات کا رقبہ
645 ایکڑ

کینجھر جھیل

22 اپریل: پانی کے ماہر ڈاکٹر محمد احسان صدیقی کے مطابق جھیل کے پانی میں ونڈمل پراجیکٹ کی طرف کرومئیم، لیڈ اور مرکری کی مقدار بالترتیب 43.52PPB، 13.89 PPb اور 5.32PPb ریکارڈ کی گئی۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق پینے کے پانی میں لیڈ 10PPb اور مرکری 1PPb ہونا چاہیے (ڈان، 22 اپریل، صفحہ 19)۔

9 مئی: کینجھر جھیل کے اطراف بسنے والی کمیونٹی کے مطابق ونڈمیل آپریٹرز پانی کے قدرتی نالوں میں کیمیکل ٹھکانے لگاتے ہیں لیکن جب بارش ہوتی ہے تو ان نالوں سے بہتا ہوا پانی جھیل میں گرتا ہے جس کی وجہ سے یہاں جانور اور پرندے مر رہے ہیں (ڈان، 9 مئی، صفحہ 20)۔

17 مئی: انوائرمینٹل پروٹیکشن ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل کے مطابق تحقیق کی ابتدائی رپورٹ کی روشنی میں کینجھر جھیل میں یوریا سمیت آلودہ عناصر کی موجودگی ثابت ہوئی ہے تاہم ابھی تک آلودگی کی حقیقی وجوہات کا پتہ نہیں چل سکا (ڈان، 17 مئی، صفحہ 18)۔

XII۔ موسمی تبدیلی اور زرعی پیداوار

21 اپریل: پاکستان ایگری فورم کے چیئرمین محمد ابراہیم مغل نے کہا کہ حالیہ بارش اور تیز ہواؤں نے گندم، کنولا، سورج مکھی کو نقصان پہنچایا جبکہ گنے کی فصل محفوظ رہی (ایکسپریس ٹریبون، 22 اپریل، صفحہ 11)۔

19 اپریل: ہری پور کے بارانی علاقوں میں خشک سالی اور شروع سیزن میں بارش سے گندم کی کٹائی (جسے مئی کے دوسرے ہفتے میں شروع ہونا تھا) کا آغاز ہو چکا ہے اور پیداوار میں 50 فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے (ایکسپریس ٹریبون، 20 اپریل، صفحہ 10)۔

11 مئی: پاکستان کونسل فار سائنس اینڈ ٹیکنالوجی نے موسمیاتی تبدیلیوں کے حوالے سے تین روزہ بین الاقوامی کانفرنس نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اسلام آباد میں منعقد کی۔ اس کانفرنس میں ماہرین نے موسمیاتی تبدیلی کو خوراک کی پیداوار کے لیے خطرہ قرار دیا۔ اسی کانفرنس میں پیش کیے گئے تحقیقی مقالے کے مطابق نیم خشک علاقوں میں 5 سے 15 فیصد، خشک علاقوں میں 8 سے 13 فیصد، بارانی اور زیر کاشت علاقوں میں 11 سے 16 فیصد گندم کی پیداوار میں کمی دیکھنے میں آسکتی ہے (ایکسپریس ٹریبون، 12 مئی، صفحہ 4)۔

27 مئی: ایک رپورٹ کے مطابق پچھلے سال سیلاب سے سندھ کی 70 فیصد مرچ کی فصل تباہ ہوئی۔ اس سال پانی کی کمی سے 50 فیصد تک فصل کم ہوسکتی ہے (ڈان، 28 مئی، ای بی آر، صفحہ III)۔

3 جون: اکنامک سروے 12-2011 کے مطابق ٹھنڈ اور بارش کی وجہ سے کپاس کی پیداوار صرف 90,000 ٹن رہی جبکہ اسی دوران پچھلے سال پیداوار 139,000 ٹن تھی (ڈان، 4 جون، صفحہ 15)۔

5 جون: ایک مضمون کے مطابق ہمالیہ کے برفانی تودوں کے دیر سے پگھلنے کے باعث پنجاب کے زیر کاشت علاقوں میں پانی کی کمی کا سامنا ہے جس سے ملک کی تین اہم فصلیں کپاس، گنا اور چاول کی بوائی میں تاخیر ہوسکتی ہے (عمران رانا کا مضمون: ایکسپریس ٹریبون، 6 جون، صفحہ 11)۔

XIII۔ قدرتی آفات

10 اپریل: ایک خبر کے مطابق حکومت پاکستان اور اقوام متحدہ کے تعاون سے شروع کیے گئے پروگرام، امداد برائے سیلاب زدگان سندھ و بلوچستان، کو مزید امداد ملنی بند ہوگئی ہے (ڈان، 11 اپریل، صفحہ 3)۔

14 اپریل: نیشنل ڈیزاسٹر منیجمنٹ کے ممبر ساجد مقیم نے میر پور خاص میں صحافیوں کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا کہ ان کا ادارہ سندھ میں مون سون سے نمٹنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ غیر ملکی ڈونر سے امداد کی گزارش کی گئی تھی جو غیر مثبت ثابت ہوئی ہے (ڈان، 14 اپریل، صفحہ 18)۔

10 مئی: نیشنل ڈیزاسٹر منیجمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین ظفر قادر نے کہا کہ یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل، سائنٹیفک آرگنائزیشن (UNESCO) نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ وہ پورے ملک کے پانی کے نالوں کی جانچ اور اس کے پیمائشی نظام کی تنصیب کیلئے 1.5 ملین ڈالر کی رقم فراہم کرے گا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا بڑی قدرتی آفات کے بعد اتھارٹی مختصر اور طویل منصوبہ بندی کرنے پر سوچ و بچار کر رہی ہے (ایکسپریس ٹریبون، 11 مئی، 2012 صفحہ 5)۔

10 مئی: سیڈ ہیڈ کوارٹر میں منعقدہ ورکشاپ میں ماحولیات، پانی اور آبپاشی کے ماہرین کا کہنا تھا کہ LBOD کو وسعت دینے کے ساتھ وہاں درختوں کو آباد کیا جائے جس سے ساحلی علاقوں میں آنے والے طوفانوں کے خلاف تحفظ میں مدد حاصل ہوگی۔ اسی حوالے سے ماہرین نے مزید تجاویز دیتے ہوئے کہا کہ ایل بی او ڈی (LBOD) کا رخ پھیر کر اس کو تھرپارکر کی جانب موڑ دیا جائے (ڈان، 11 مئی، صفحہ 18)۔

16 مئی: ممکنہ بارشوں کے پیش نظر نیشنل ڈیزاسٹر منیجمنٹ اتھارٹی کی جانب سے خبردار کیا گیا کہ جولائی تا ستمبر کے درمیان مون سون سیزن سے ایسے سیلاب آنے کا اندیشہ ہے جس سے ملک کے 29 ملین افراد متاثر ہو سکتے ہیں (ڈان، 17 مئی، صفحہ 3)۔

21 مئی: ممکنہ بارشوں سے نمٹنے کے لیے چیف منسٹر سندھ کے ایڈوائزر کا کہنا تھا کہ صوبائی حکومت نے مکمل اور جامع منصوبہ تیار کرلیا ہے (دی نیوز، 22 مئی، صفحہ 18)۔

31 مئی: اکنامک سروے آف پاکستان کے مطابق 2011 کے سیلاب کے باعث سندھ اور بلوچستان کو مختلف شعبہ جات میں 325 بلین روپے کا نقصان اٹھانا پڑا ہے (ڈان، پہلی جون، صفحہ 3)۔

14 جون: ایک خبر کے مطابق اسٹیٹ بینک نے 2010 اور 2011 کے سیلاب سے نقصانات کے بعد فصل کی انشورنس کی پالیسی کا اعلان کردیا ہے لیکن حکومت اس پر عمل درآمد آج تک نہیں کرپائی (ڈان، 15 جون، صفحہ 15)۔

18 جون: وزیر اطلاعات صوبہ خیبر پختونخواہ نے پریس کانفرنس میں کہا کہ سیلاب سے بچاؤ اور اس خطرے کو کم کرنے کا منصوبہ کابینہ نے منظور کرلیا ہے (ڈان، 19 جون، صفحہ 5)۔

27 جون: چیف منسٹر ہاؤس سندھ میں رین ایمرجنسی سیل قائم کردیا گیا ہے جو کہ چوبیس گھنٹے فعال رہنے کے ساتھ صوبے بھر میں بارشوں سے پیدا ہونے والے مسائل کی نگرانی کرے گا (دی نیوز، 28 جون، صفحہ 13)۔

XIV۔ مزاحمت

1 اپریل: لاہور میں میرانی ڈیم کے سیلاب زدگان کے نمائندے شریف شمس بیزی نے کہا کہ مرکزی حکومت کی طرف سے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی میرانی ڈیم کے سیلاب زدگان کو معاوضہ نہیں دیا گیا لیکن ہم اپنا احتجاج معاوضے کی ادائیگی تک جاری رکھیں گے (ایکسپریس ٹریبیون، 2 اپریل، صفحہ 2)۔

5 اپریل: سن کے قریب دادو میں انڈس ہائی وے پر کسانوں کی بڑی تعداد نے محکمے خوراک کے خلاف مظاہرہ کیا کیونکہ ابھی تک نہ تو گندم خریداری کے لیے بوریاں فراہم کی گئی ہیں اور نہ حکومتی مراکز قائم ہوئے ہیں (ڈان، 16 اپریل، صفحہ 18)۔

22 اپریل: گندم کی خریداری میں دیر اور تھیلوں کی تقسیم میں خود برد کے خلاف کسانوں کی بڑی تعداد نے صالح پٹ، پنو عاقل اور روہڑی میں مظاہرہ کیا (ڈان، 23 اپریل، صفحہ 16)۔

27 اپریل: رب نواز اور ریاض احمد دونوں گنے کی کاشت کرتے ہیں۔ انہوں نے چشتیاں شوگر ملز کے خلاف الگ الگ ایف آئی آر میں الزام لگایا کہ جب وہ 11-2010 کی گنے کی خریداری کے پیسے کا تقاضہ کرنے وہاں گئے تو مل انتظامیہ نے انہیں فیکٹری میں قید کرلیا۔ مل انتظامیہ کو انہیں الگ الگ 444,000 اور 4 ملین روپے دینے تھے۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ چشتیاں شوگر مل کے خلاف 2012 میں دائر یہ بارہواں کیس ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 28 اپریل، صفحہ 5)۔

6 مئی: لاہور میں پاکستان متحدہ کسان محاذ کی کانفرنس میں کسانوں نے کہا کہ اگر وفاقی حکومت نے گندم کی گرتی ہوئی قیمت کو اگلے 72 گھنٹوں میں قابو میں نہ کیا تو وہ اپنے مسائل کی ایک دستاویز گورنر کے سامنے پیش کریں گے اور اگر حکومت نے ان کے جائز مطالبات کو تسلیم نہ کیا تو وہ گندم کی فصل کو گورنر ہاؤس کے سامنے جلا دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ کسان پہلے ہی پانی کی کمی کا شکار ہیں (ڈان، 7 مئی، صفحہ 2)۔

9 مئی: ٹنڈو الہ یار میں زمیندار کے خلاف کسانوں کی بہت بڑی تعداد نے مظاہرہ کیا۔ کسانوں کو یہ خوف ہے کہ پانی کی فراہمی میں رکاوٹ ڈال کر زمیندار ان کی زمین ہتھیانا چاہتا ہے (ڈان، 10 مئی، صفحہ 18)۔

13 جون: گلگت میں تھور وادی کے مکینوں نے ڈسٹرکٹ انتظامیہ کے خلاف بھاشا ڈیم کی زمین کے کم تخمینے پر مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی زیر کاشت زمین کو بنجر بنا کر پیش کیا گیا اور لینڈ کومپنسیشن ایواڈ کی تفصیل ان سے پوشیدہ رکھی گئی (ڈان، 14 جون، صفحہ 5)۔

17 جون: ناران باڑا کنڈی کے گاؤں میں گوجر قبیلے کی تین عورتوں کو فرنٹیئر ورکرز آرگنائزیشن (FWO) کے سیکورٹی افسران نے اپنی فائرنگ سے زخمی کردیا۔ گوجر قبیلہ پچھلے 50 سالوں سے شاملات (جس میں علاقے کی زمین تمام لوگوں کی مجموعی ملکیت ہوتی ہے) کے تحت کاشتکاری کررہا تھا۔ یہ زمین بغیر قبیلے والوں کی اجازت کے بیچی نہیں جاسکتی تھی لیکن خیبر پختونخواہ کے صوبائی وزیر سید احمد شاہ نے یہ زمین FWO کو بیچ ڈالی اس کے خلاف قبیلے والوں نے کوٹ سے اسٹے حاصل کرلیا جس کے باوجود جب زمین ہتھیانے FWO والے وہاں پہنچے تو قبیلے والوں کی مزاحمت سے تین عورتیں زخمی ہوئیں جن میں سے ایک کی حالت نازک ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 18 جون، صفحہ 2)۔

21 جون: انجمن کاشتکاران مانسہرہ نے FWO کے ان افراد کو حراست میں لینے کا مطالبہ کیا ہے جنہوں نے باڑا کنڈی میں مزدور عورتوں کو اپنی فائرنگ سے زخمی کیا (ایکسپریس ٹریبیون، 26 جون، صفحہ 3)۔

28 جون: لاڑکانہ ڈسٹرکٹ میں گندم کی خریداری کی رقم ادا نہ کرنے کے خلاف کسانوں کی طرف سے مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ فوڈ انسپکٹر کے مطابق ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر نے 30,000 بوریوں کی قیمت جو 78.7 ملین روپے بنتی ہے ادا نہیں کی ہے (ایکسپریس ٹریبیون، 29 جون، صفحہ 11)۔

ب بین الاقوامی خبریں

ا۔ زرعی مواد

زمین

14 جون: ایک اخباری مضمون کے مطابق میانمار (برما) میں 1990 کے آخر سے غیر ملکی کمپنیوں کو زمین کی بڑی اراضی لیز پر دینے کے رجحان میں 900 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ملک کا تقریباً 5 فیصد زرعی رقبہ بیرونی کمپنیوں کے ہاتھ میں جاچکا ہے۔ ملک کی کل آبادی 47 ملین ہے جس میں سے 70 فیصد دیہی آبادی کی ایک تہائی کے پاس زمین نہیں (ایکسپریس ٹریبیون، 14 جون، صفحہ 6)۔

جینیاتی بیج

16 اپریل: ایک خبر کے مطابق جینیاتی بیج کے فوائد اوراری (IRRI) فلپائن کی اس حوالے سے خدمات گنوانے کے لیے کسانوں کے چھٹے پین ایشیاء تبادلے کے پروگرام کو مارچ کے آخری ہفتے میں کروپ لائف (Crop Life) ایشیاء اور فلپائن کی بائیوٹیک کولیشن (Biotech Coalition) نے منعقد کیا۔ یہ پروگرام اپریل کے شروع تک اختتام پزیر ہوا۔ اس کے مختلف سیشن ہوئے جس میں سائنسدانوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور جینیاتی سائنس کو فروغ دینے کے لیے مقالے پڑھے (دی نیوز، 17 اپریل، صفحہ 18)۔

II۔ غربت اور غذائی عدم تحفظ

25 اپریل: عالمی بینک کی فوڈ پرائس واچ کے مطابق تیل کے بحران، موسمی تبدیلی اور ایشیاء میں غذائی درآمدات کے اضافے کی وجہ سے خوراک کی قیمتوں میں دسمبر 2011 سے مارچ 2012 تک 8 فیصد اضافہ ہوا ہے (ڈان، 26 اپریل، صفحہ 9)۔

18 مئی: G-8 میٹنگ سے پہلے امریکی صدر اوبامہ نے نجی شعبے کا غذائی تحفظ کے حوالے سے نیا اتحاد بنا کر افریقہ میں زراعت اور خوراک کے لیے 3 بلین ڈالر کی امداد کا اعلان کیا۔ کیمپ ڈیوڈ میں G-8 میٹنگ میں یورپین یونین کے مالی بحران اور افریقہ میں غذائی تحفظ پر بات چیت ہوگی (ڈان، 19 مئی، صفحہ 12)۔

4 جون: یو اے ای نے یمن کو 500 ملین درہم کی غذائی امداد کا اعلان کیا۔ یمن میں 44 فیصد لوگ غذائی عدم تحفظ میں مبتلا ہیں (دی نیوز، 5 جون، صفحہ 17)۔

8 جون: ایک اخباری خبر کے مطابق ہندوستان میں 250 ملین لوگ غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں جبکہ ہندوستان کے اس وقت اناج کے ذخائر چین کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں جنہیں بڑے پیمانے پر برآمد بھی کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی یہ بھی کوشش ہے کہ ایسی قانون سازی کی جائے جس کے ذریعے غریب سستی قیمت پر زیادہ چاول اور گندم خرید سکے (ایکسپریس ٹریبیون، 9 جون، صفحہ 1، عالمی ایڈیشن)۔

III۔ نقد آور فصلیں

16 جون: ماہرین کے مطابق دنیا بھر کے کپاس کے کاشتکار پچھلے سال کی بنسبت روئی کی 100 فیصد گرتی ہوئی قیمت سے سخت مایوس ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے کاشتکار بی ٹی کپاس کے بیج کے معیار سے مطمئن نہیں ہیں (دی نیوز، 16 جون، صفحہ 15)۔

پام آئل کا اتار چڑھاؤ

6 اپریل: امریکہ میں خشک سالی کی وجہ سے یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ وہاں کسان کم سویابین کاشت کرپائیں گے جس کی وجہ سے سٹے بازوں نے پام آئل کی قیمتیں چڑھانی شروع کردیں۔ دسمبر 2011 سے مارچ 2012 تک ان قیمتوں میں 5 فیصد اضافہ ہوا یہ سطح پچھلے 13 مہینوں میں سب سے زیادہ تھی (ڈان، 17 اپریل، صفحہ 10)۔

18 اپریل: پام آئل کی قیمتیں گرنا شروع ہوگئیں سرمایہ کاروں کے اس ڈر سے کہ کہیں یورو زون میں قرض کا بحران یورپ میں کھانے کے تیل کی طلب کو کم نہ کردے (ڈان، 19 اپریل، صفحہ 10)۔

IV۔ کارپوریٹ سیکٹر

23 اپریل: خوراک کی سوئیز کمپنی نیسلے (Nestle) نے فائزر (Pfizer) سے بچوں کی خوراک کے بزنس کو 11.9 بلین ڈالر میں خرید لیا۔ جنوبی امریکہ میں نیسلے کا اپنا بہت بڑا بچوں کے خوراک کا بزنس ہے۔ فائزر کا بزنس خرید کر نیسلے کو ایشیاء پیسفک میں اپنا تیزی سے بڑھتے بزنس کو مزید فروغ ملے گا (ایکسپریس ٹریبیون، 24 اپریل، صفحہ 12)۔

27 اپریل: ایک رپورٹ کے مطابق ڈاؤ کیمیکل امریکی ریگولیٹری (regulatory) ادارے سے ایسی مکئی کے بیج کے لیے اجازت حاصل کروانا چاہ رہا ہے جسے جینیاتی طریقے سے ایسے تبدیل کیا گیا ہے کہ اس سے پیدا ہونے والا پودا 2,4-D کیمیکل کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ راؤنڈ آپ (Roundup) جس سے جنگلی گھانس پھونس کو مارا جاتا تھا اب ان چیزوں کے خلاف بے اثر ہو چکا ہے۔ ماحولیات کے حوالے سے متحرک گروپز نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ڈاؤ مکئی سے 2,4-D کیمیکل کے استعمال میں بہت زیادہ اضافہ ہوجائے گا جس سے صحت کے خطرناک مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ پھل اور سبزی اگانے والے کسانوں نے بھی ماحولیاتی گروپ کے ساتھ مل کر امریکی حکومت سے درخواست کی ہے کہ ایسی مکئی کی فی الحال اجازت نہ دی جائے (ایکسپریس ٹریبیون، 27 اپریل، صفحہ 13)۔

> 2,4-D کیمیکل ایجنٹ اورنج کا اہم جز تھا جسے امریکہ نے ویت نام کی جنگ میں استعمال کیا تھا تاکہ سبزہ ختم کرکے ویت نامیوں کو باآسانی نشانہ بنایا جاسکے۔

V۔ موسمی تبدیلی

9 اپریل: امریکی خلائی ادارے ناسا (NASA) کے رہنما موسمی سائنسدان پروفیسر جم ہینسن (Jim Hansen) نے اپنے ایک لیکچر میں کہا کہ انسانوں کی طرف سے پیدا کی گئی موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لیے موسمی تبدیلی کی صورت میں ایک خطرناک صورتحال پیدا کرتے جا رہے ہیں جو ان کے قابو سے باہر ہوگی (سیورین کاویل کا مضمون: ڈان، 19 اپریل، صفحہ 7)۔

16 اپریل: موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے جاری کیے گئے ایک اعلانیہ میں سائنسدانوں نے بتایا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے گلیشئرز (برفانی تودے) بڑھتی ہوئی گرمی کی وجہ سے پگھل رہے ہیں اور سطح سمندر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب فرانس کی ایک ٹیم نے 3-D سیٹلائیٹ نقشوں کے ذریعے بتایا ہے کہ 2000 سے 2008 کے عرصے کے دوران گلیشئر کے تودوں میں 0.11 ملی میٹر تک کا سالانہ اضافہ دیکھا گیا ہے۔ (ڈان، 16 اپریل، صفحہ 11)۔

1 جون: ناروے میں امریکہ کی سیکریٹری آف اسٹیٹ ہیلری کلنٹن نے موسمی درجہ حرارت

بڑھنے کی وجہ سے قطب شمالی کی بدلتی صورتحال کو دیکھا۔ اس صورتحال سے خطے میں جمع شدہ تیل کے حصول کے لیے مقابلے کا رجحان دیکھنے میں آ سکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق قطب شمالی میں موجود تیل جس سے ابھی تک استفادہ حاصل نہیں کیا جاسکا اس کی اہمیت 900 ٹریلین ڈالر ہے (ڈان، 2 جون، صفحہ 1)۔

22 جون: یونائیٹڈ اسٹیٹس نیشنل ریسرچ کونسل کی مطالعاتی رپورٹ کے مطابق 21 ویں صدی میں دنیا کی سمندری سطح 55-20 انچ کے درمیان تک بڑھنے کا امکان ہے (ڈان، 23 جون، صفحہ 13)۔

24 جون: نیچر کلائمٹ چینج (موسمی تبدیلی) کی مطالعاتی رپورٹ کے مطابق بحراوقیانوس کی بڑھتی ہوئی سمندری سطح کی وجہ سے امریکہ کے ساحلی شہروں، نیویارک، نارفوک اور بوسٹن خطرے کی نوک پر ہیں (دی نیوز، 25 جون، صفحہ 11)۔

VI۔ قدرتی آفات

27 جون: سرکاری ذرائع کے مطابق بنگلہ دیش میں اچانک شدید سیلاب سے 94 افراد موت کا شکار ہوئے جبکہ 200,00 افراد بے گھر ہوگئے (ایکسپریس ٹریبیون، 28 جون، صفحہ 11)۔

29 جون: سرکاری ذرائع کے مطابق پرشور مون سون بارشوں اور پیدا ہونے والے سیلاب کی وجہ سے مشرقی ہندوستان کی 1.3 ملین دیہی آبادی نقل مکانی پر مجبور ہوگئی (دی نیوز، 30 جون، صفحہ 25)۔

چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی خوشحالی صرف اور صرف پائیدار زراعت پر مبنی اسکیموں کو متعارف کرانے میں ہے جس سے نہ صرف کسان خودمختار ہوتا ہے بلکہ ماحولیاتی تبدیلیوں سے بھی نمبرد آزما ہوسکتا ہے۔ چند جاگیردار خاندان جو پاکستان کی زیادہ تر زمینوں پر قابض ہیں کو خوش کرنے کی یہ اسکیم ہمارے کسانوں کی ہرگز ضرورت نہیں۔ ٹریکٹر جیسی اسکیموں سے صرف اور صرف دو طبقوں کے مفادات کا فروغ ممکن ہے۔ ایک سرمایہ دار جو ٹریکٹر بناتا ہے اور دوسرا زمیندار جو ان ٹریکٹروں کو اپنی بڑی بڑی زمینوں پر استعمال کرتا ہے۔ موجودہ حکومت جو کہ پچھلے ساڑھے چار سال میں عوام کو کسی طرح کی بھی سہولت نہ دے سکی، ٹھیک انتخابات سے قبل رعایتی قیمتوں پر ٹریکٹر کی تقسیم کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت بڑی بڑی جاگیروں کو منصفانہ اور مساویانہ طور پر چھوٹے کسانوں میں تقسیم کردے تاکہ زمین کے چھوٹے چھوٹے رقبے پر پائیدار زراعت کے اصولوں کے تحت زراعت کو فروغ دیا جائے جس سے اشرافیہ کے مفادات کے تحفظ کے بجائے ہزاروں لاکھوں کسانوں کا روزگار محفوظ ہو اور ملک و عوام خوشحال ہوں۔

تبصرہ

اگر ہم پچھلے تین مہینوں کی خبروں کا جائزہ لیں تو زرعی مواد سے لے کر زرعی مداخل اور غربت تک ہمیں تجزیے کی ایک پوری کڑی نظر آئے گی۔ زرعی مواد میں زمین، بیج اور پانی کی خبروں پر نظر ڈالیں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ زمین کی نامساویانہ تقسیم کے ساتھ ساتھ مستقل کسی نہ کسی بہانے سے زمین ہتھیانے کا عمل جاری ہے۔ اس صورت حال میں غذائی تحفظ ناممکن نظر آتا ہے۔ کسانوں کے حقوق کی پامالی زیادہ پیداوار کی لالچ میں ناقص بیج کے ذریعے کی گئی۔ ان بیجوں کے لیے یوریا اور دوسری مصنوعی کھادیں ضروری عنصر ہیں۔ یوریا کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر کسانوں نے اس کے استعمال کو کم کرنا شروع کر دیا ہے لیکن ہائبرڈ بیج اور جینیاتی بیج کے ساتھ وہ یوریا کے استعمال کو ترک نہیں کر پائیں گے کیونکہ یوریا ان بیجوں کی ضرورت ہے۔ اپنے اصلی روایتی بیجوں کے استعمال سے ہی کسان یوریا کی ضرورت سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ دیسی بیج کے لیے گوبر وغیرہ کی کھاد کافی ہوتی ہے اور ان بیجوں کو ہائبرڈ بیج کی بنسبت کم پانی درکار ہوتا ہے لہذا پانی کی مستقل کمی کے مدنظر بھی یہ حل زیادہ پائیدار ہے۔ جب کسان کے خرچے کم ہوں گے تب ہی اسے زراعت سے کچھ فائدہ ہوگا۔ اس فائدے کو غذائی تحفظ کا باآسانی ذریعہ بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ زراعت کو آزاد تجارت کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔ مائیکرو کریڈٹ سے مداخل خرید کو عالمی مارکیٹ کے لیے کسی ایک فصل کو بڑے پیمانے پر کاشت کرنا نہ صرف حیاتیاتی تنوع کو تباہ کرتا ہے بلکہ زمین کی زرخیزی، پانی کے استعمال اور غذائی تحفظ سب کو متاثر کرتا ہے۔ ایسی صورت حال میں، خالی خزانے کے ساتھ، حکومت خود لوٹ کھسوٹ میں لگ جاتی ہے۔ گندم کی خریداری ہو یا یوریا کی درآمد ہر جگہ ہمیں حکومت کسانوں کے حقوق کچلتی نظر آتی ہے۔

فارمرز ایسوسی ایشن آف پاکستان کے مطابق سرکاری گندم کی خریداری کی مہم کے دوران کسانوں کو 15-10 بلین روپوں کا نقصان ہوا۔ محکمہ خوراک اور پاسکو نے سرکاری قیمت کی بجائے گندم 925-900 روپے فی 40 کلوگرام پر خریدی اور اس پر بھی گندم میں نمی، معیار اور دیگر بہانوں سے قیمت کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح زرعی شعبہ آمدنی پر ٹیکس کی بات کو رد کرتا ہے۔ زرعی تنظیموں کے مطابق ''اس سے تمام زرعی آبادی کو انکم ٹیکس کا محکمہ اپنا اسیر بنالے گا''۔ کسان پہلے ہی زرعی مشینری اور دیگر مداخل پر ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ آبیانہ بڑھانے پر سامراجی طاقتوں کا بڑا اسرار ہے تاکہ پانی جیسی نعمت بھی پوری طرح نجی تحویل میں چلی جائے۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ دنیا کی ایک بہت بڑی خوراک کی کمپنی نیسلے، جس کی منرل پانی کی بوتلیں اور دودھ کے ڈبے پاکستان بھر میں نظر آتے ہیں، نے اب فائزر سے بچوں کی خوراک کے بزنس کو بھی خرید لیا ہے۔ اس کے بعد وہ ایشیاء پیسفیک میں اپنے بزنس کو مزید فروغ دے سکے گی۔ اسی طرح ہماری حیات کی بقاء سے بڑی بنیادی غذائی اشیاء پر قبضہ کر کے بڑا منافع کمایا جاتا ہے۔ حکومت زیادہ تر ٹیکس وصول کر کے ان بین الاقوامی اقتصادی اداروں کی صرف قسطوں کو ادا کرتی ہے جو بین الاقوامی کمپنیوں کے مفاد کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ قرضے لینے کا جال کمپنیوں کے کارندے ہی پھینکتے ہیں چاہے وہ بیج، یوریا اور زرعی ادویات کے لیے مائیکروفنانس کے ذریعے ہوں یا یو ایس ایڈ اور یو ایس ڈی اے یا دیگر ذرائع سے۔ زرعی آزاد تجارت مارکیٹ معیشت کو بھی یہی طاقتیں فروغ دے رہی ہیں۔ پاکستان میں امریکی، برطانوی اور دیگر امدادی ایجنسیوں کا پھل اور خوراک میں کردار عوام کے لیے شدید بھوک اور مزید غربت کا باعث بنے گا۔ ایک طرف زرعی اشیاء برآمد کر کے زرمبادلہ حاصل کر کے قرضوں کی قسطوں کی ادائیگی ہوتی ہے تو دوسری طرف درآمدات میں بے تحاشہ اضافہ کروایا جاتا ہے۔ لہذا تجارت کا خسارہ برقرار ہی نہیں رہتا بلکہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ ایک اور بھرپور وار مستقل عدم تحفظ میں مبتلا کر کے اسلحے کے کاروبار کو جاری وساری رکھنے کا ہے تاکہ کمپنیوں کا کاروبار چلتا رہے۔

آبادی میں اضافہ، زرعی عدم تحفظ اور موسمی تبدیلی کے حوالے سے جینیاتی بیج اور ایتھنول کی کاشت کو بھی یہی عناصر فروغ دے رہے ہیں جو ماحول کی تباہی، غذائی عدم تحفظ اور وسائل کے زیاں کے ذمہ دار ہیں۔ امریکی کمپنی مونسانٹو اب بی ٹی کپاس کے بعد بی ٹی مکئی کی بات کر رہی ہے۔ پنجاب میں اس کے فلڈ ٹرائل یا زمینی تجربہ ہو چکا ہے۔ خوراک کی جینیاتی بیج کی اجازت بہت کم ممالک نے دی ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان نے بی ٹی بینگن کے بیج کے لیے بین الاقوامی دباؤ کو بہت منظم طریقے سے روکا ہے کیونکہ انسانی صحت اور ماحول پر ان بیجوں کے اثرات پر بحث بہت شدید ہے۔ پاکستان میں اس کے خلاف بھرپور مزاحمت کی ضرورت ہے لیکن ہوتا کیا ہے کہ بڑے زمیندار اور جاگیردار اس خطرناک بیج کی غیر قانونی طریقے کار سے کاشت کر لیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار کی لالچ میں جب کسان اس کو اپنا لیتے ہیں تو بیج کی بین الاقوامی کمپنیاں اپنی ڈور کھینچتی ہیں تاکہ ان بیجوں پر وہ اپنا حق ملکیت منوا سکیں۔ انہوں نے ایک جاندار چیز کے اندر دوسری جاندار چیز ڈال کر قدرتی نظام میں جادو کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ جس کی قیمت ڈبلیو ٹی او کے ذہنی ملکیت کے معاہدے کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت پاکستان سے زبردستی وصول کریں گے۔ اس کے علاوہ بیج کی قیمت میں کئی گنا اضافے کے ساتھ کمپنیوں کی طرف سے کسانوں پر کئی طرح کی پابندیاں بھی عائد ہوں گی۔ اس موضوع کی تفصیل چیلنج کے اگلے شمارے میں ملاحظہ کریں۔

کسان دوست تنظیمیں عالمی سطح پر اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ عالم گیریت کے جال میں پھنسنے کے بجائے کسانوں کا تحفظ صرف خوراک کی خودمختاری کے اندر ہی ممکن ہے۔ اس کے ذریعہ سبز انقلاب کے زمانے سے محتاجی کی زنجیروں میں جکڑی گئی زراعت کی بحالی ممکن ہوسکتی ہے اور کسان اپنے استحکام کے ذریعہ ملک کے استحکام کی پائیدار بنیاد بن سکتے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس سال جو پائیدار ترقی کا عالمی منصوبہ بنایا گیا ہے اگر اس کو سامنے رکھیں تو ''زرعی ترقی'' کے نام پر حکومت کی پالیسی سازی پائیدار ترقی کے بالکل مخالف سمت میں جارہی ہے۔